اُنیس بیس

—— مزاحیہ مضامین

ڈاکٹر حبیب ضیاء

سلسلہ مطبوعات زندہ دلان حیدرآباد

سال اشاعت : جنوری ۱۹۸۸ء
کتابت و سرورق : محمد غوث الدین
تعداد : ایک ہزار
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ حیدرآباد
قیمت : ۱۶ روپے

ملنے کے پتے

دفتر شگوفہ، بیچلرس کواٹرس، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد
بک ڈپو، انجمن ترقی اردو، اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد
الیاس ٹریڈرس۔ شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد
حسامی بک ڈپو، چارکمان، حیدرآباد
سیل کاونٹر، روزنامہ سیاست، حیدرآباد
ایوان اردو، ناظم آباد، کراچی، پاکستان

ڈیڑھ سالہ نواسی سارہ

کے نام

خدا اسکی عمر دراز کرے، دین و دنیا کی نعمتیں عطا فرمائے، ماں باپ اور سب رشتہ داروں کے علاوہ اس کے دل میں اردو کی بھی محبت جاگے، بڑی ہوکر وہ یہ کتاب پڑھے اور اپنی سہیلیوں سے فخریہ کہے "یہ کتاب میری مرحوم نانی نے لکھی تھی"۔



حبیب ضیا

تاریخ پیدائش	----------	یکم ، نومبر ۱۹۳۵ء
ایم ۔ اے	----------	۱۹۵۹ء
" دکنی زبان کی قواعد "	----------	مطبوعہ ۱۹۶۳ء
پی ایچ ڈی	----------	۱۹۶۶ء
" مہاراجہ کشن پرشاد شاد "	----------	مطبوعہ ۱۹۷۸ء
" گوتم مشکل "	----------	مطبوعہ ۱۹۸۱ء
ملازمت	----------	۱۹۶۷ء تا ۱۹۸۴ء

اورینٹل اردو کالج، اردو ہال، حمایت نگر

۱۹۸۴ء تا حال

یونیورسٹی کالج فار ویمن (جامعہ عثمانیہ)

مصنف کی دوسری کتابیں

گویم مشکل .... طنزیہ و مزاحیہ مضامین

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد؛ حیات اور ادبی خدمات

دکنی زبان کی قواعد

زیر طبع

دکنی زبان کی قواعد (دوسرا نظرثانی شدہ ایڈیشن)

شاد و نیاز (نیاز فتح پوری اور مہاراجہ کشن پرشاد کی خط و کتابت)

ترتیب

پیش لفظ

"گویم مشکل" کے بعد طنزیہ مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ "انیس بیس" قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔ مالک کا لاکھ احسان ہے کہ میری تینوں کتابیں "دکنی زبان کے قواعد" "مہاراجہ کشن پرشاد حیات اور کارنامے" اور "گویم مشکل" ادبی حلقوں میں سراہی گئیں۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی اور اتر پردیش اردو اکیڈیمی نے اپنے گراں قدر ایوارڈز اور توصیف ناموں سے نوازا۔ ایچ ای ایچ دی نظامس ادبی ٹرسٹ اور آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کا مالی تعاون بھی حاصل رہا۔

گذشتہ سال میری والدہ محترمہ فخر النساء بیگم صاحبہ پاکستان سے حیدرآباد تشریف لائیں۔ وہ بڑی خدا ترس اور دریا دل خاتون ہیں۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ چند دن قبل انہیں انعامی بانڈ میں دس ہزار روپے ملے، انہوں نے اللہ میاں سے وعدہ کیا تھا کہ انعام کی رقم خود خرچ نہیں کریں گی بلکہ کسی ضرورت مند کو دیں گی۔ میں نے اپنے مضامین کے بکھرے کاغذات کے آگے پسار کر کہا "اس وقت تو سب سے بڑی ضرورت مند میں ہی نظر آ رہی ہوں" اس طرح ہنسی ہنسی میں کتاب کے چھپنے کا سامان ہو گیا۔

اس مجموعے کے کئی مضامین آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہو چکے ہیں "عید" روزنامہ سیاست میں "حیدرآباد کی شادیاں" روزنامہ رہنمائے دکن میں اور بیشتر روزنامہ منصف، شگوفہ، سب رس (پاکستان) اور دوسرے ادبی رسائل میں

شائع ہو چکے ہیں۔ صحافت، آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد اور زندہ دلان حیدرآباد کا شکریہ ادا کرنا میرا اولین فریضہ ہے۔ محمد غوث الدین نے اس کتاب کی کتابت اور سرورق بنانے کا کام نہایت محنت، دلچسپی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ میری نیک تمنائیں ہمیشہ ان کے ساتھ ہیں۔ کتاب کے لئے کوئی موزوں نام میرے ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ غوث نے یہ مشکل بھی آسان کردی۔ "اُنیس بیس" انہیں کا تجویز کردہ نام ہے۔

ادبی مشغلوں کو جاری رکھنے کے لیئے پرسکون ماحول کی بڑی ضرورت اور اہمیت ہے۔ اس سلسلے میں گھر کے افراد کے علاوہ کالج کے پرنسپل صاحبین کا خصوصیت سے ذکر کروں گی۔ انہوں نے نہ صرف میرے مضامین پڑھے بلکہ وقتاً فوقتاً داد بھی دی۔ پروفیسر حسینی شاہد صاحب پرنسپل اردو آرٹس کالج، پروفیسر قادری بیگم صاحبہ سابق پرنسپل ویمنس کالج اور پروفیسر بدر تقی خان صاحبہ کے خلوص اور شفقت کو میں کبھی بھلا نہ پاؤں گی۔

ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال صاحب مدیر ماہنامہ شگوفہ کا شکریہ ادا کرنا میرا اہم اور آخری فرض ہے جنہوں نے درخواست پر اس کتاب کی طباعت اور اس کے بعد کے سارے مراحل اور ذمہ داریوں کو سر لے کر اپنی مصروفیات میں دوگنا بلکہ چارگنا اضافہ کرلیا۔

حبیب ضیاء

NB- 13,

IDPL COLONY,

BALANAGAR,

HYDERABAD, 37, A.P.

عید

عید کے معنی خوشی کے ہیں۔ عید اپنے وقت پر آتی ہے۔ کسی کو اچانک بہت زیادہ خوشی ملتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے بے وقت کی عید منائی۔ بہت دنوں تک غائب رہنے کے بعد کوئی آتا ہے تو اسے کہتے ہیں "تم تو عید کا چاند ہو گئے"۔ وقت گزر جانے کے بعد بے موقع کام کریں تو اس کے لیے "عید کے پیچھے ٹر" والی کہاوت استعمال کی جاتی ہے۔

ماہ رمضان کا چاند دیکھتے ہی لوگ عید کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ عید کے لیے خریدی جانے والی چیزوں میں سب سے پہلا نمبر کپڑوں کا آتا ہے۔ بعض لوگ سہولت کی خاطر علی الحساب بیس پچیس میٹر کپڑا ایک ہی پرنٹ کا خرید لیتے ہیں۔ صدر خاندان کا شرٹ بنانے کے بعد جو کپڑا بچتا ہے اس میں سلسلہ وار بچوں کی عمر اور قد کے لحاظ سے درزی کو ناپ دے کر چار پانچ جتنے بھی شرٹ درکار ہوں، سلوا لیتے ہیں۔ یہی فارمولا لڑکیوں کے کپڑوں کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ نماز پڑھ کر مختلف گھروں کے شیر خرمے کا ذائقہ چکھنے کے لیے جب یہ یونیفارم والی ٹیم باہر ملتی ہے تو ہر کسی کی نظریں اس پر جم جاتی ہیں۔ کثیر العیال دیکھتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے ماشاءاللہ نکل جاتا ہے۔ ہم دو ہمارے دو والا دیکھتا ہے تو زبان کو لگام دیتے

بغیر پوچھتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ جاتا ہے گھر میں اور کہتے ہیں ؟

عید کی آمد سے قبل زکواۃ دینے کے فرض سے بھی سبکدوشی ضروری ہے۔ اکثر لوگ زکواۃ کے کپڑے خریدنے کے لیئے ایسی دکان تلاش کرتے ہیں جہاں کم سے کم روپیوں میں زیادہ سے زیادہ زکواۃ کا ثواب مل جائے "ایک ساڑی کی قیمت میں تین ساڑیاں" ایسے ہی ثواب کمانے والوں کے لیئے فروخت ہوتی ہیں۔

عید اور شیر خرما لازم و ملزوم ہیں۔ شیر خرما پینے کی چیز ہے لیکن بعض ماہر پکوان خواتین اس میں سیویوں کے علاوہ گھی، بادام، چرونجی، زعفران اور کھجور کثیر مقدار میں ملاتی ہیں کہ وہ گاڑھا ہو کر "شیر قورمہ" بن جاتا ہے۔ ہر دفعہ ایک نئی چیز منہ میں آتی ہے۔ کبھی پنڈ کھجور کا بڑا ٹکڑا تو کبھی کشمش اور کبھی غلطی سے رہ جانے والا ثابت بادام۔ تھوڑی دیر کے لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیر خرما نہیں بلکہ کوئی معجون ہے۔

عید کے دن ہر گھر میں سیویاں ابالی جاتی ہیں۔ سیویں کا میٹھا بنتا ہے اور سیویں کا شیر خرما بنتا ہے۔ شیر خرما صرف گھر پر ہی نہیں پلایا جاتا بلکہ اڑوس پڑوس دوست احباب اور رشتہ داروں کے پاس خاص اہتمام سے بھیجا بھی جاتا ہے مختلف گھروں سے شیر خرمے کے جو حصے آتے ہیں انہیں خالی کرنا اور رکھنا بڑے معرکے کا کام ہے۔ ایک گھر سے آئے ہوئے شیر خرمے میں باریک سیویاں ہوتی ہیں تو ایک میں موٹی۔ ایک میں بیمار چرونجی کی کثرت ہوتی ہے تو ایک میں صحتمند بادام۔ ایک کٹورے میں چمچے کو غوطا دیں تو اس کی تہہ سے دودھ پینے ہوئے مست کھجور برآمد ہوتے ہیں تو ایک میں کھوپرا تیرنے کے موڈ میں رہتا ہے سیویوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ ابلی ہوئی، بہت ابلی ہوئی، بہت زیادہ ابلی ہوئی اور حلوہ نما جیسی بھی ہوں، کھوپرا اپنی رنگینیوں سمیت ضرور موجود رہتا ہے۔ عید کے دن ہوشیار خواتین باورچی خانے میں دو خالی بگونے رکھتی ہیں۔ مختلف جگہوں سے آنے والے کٹوروں کو ایک

بگونے میں اور طشتریوں کو دوسرے بگونے میں انڈیل کر حصہ بھیجنے والے کو شکریہ، سلام اور عید مبارک کہلوا بھیجتی ہیں۔ جب انہیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب کہیں سے حصہ نہیں آئے گا وہ جیستی کے ساتھ اس نورنگ شیر خرمے اور ملٹی کلر سیویوں کے حصے لگانا شروع کردیتی ہیں۔ اوپر سے اپنے ہاتھ کے تلے ہوئے کاجو اور اپنے ہی ہاتھوں سے رنگا ہوا کھوپرا بکھیر دیتی ہیں۔ آن کی آن میں سارے لوگوں سے نبٹ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتی ہیں۔

نوکر جتنا پرانا ہوتا ہے مالک کے لیئے اتنا ہی عذاب جان بنتا ہے۔ ایک گھر میں ماما برسوں سے کام کرتی چلی آرہی تھی۔ پکوان، گھر کی صفائی کے ساتھ ہاتھ کی صفائی میں بھی اسے کامل مہارت تھی۔ مالکن اسے نکال باہر کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن جب بھی کوئی چیز چوری جاتی وہ اسے یوں کوستیں

"خدا کرے تیرے دیدے گھٹنے پھوٹ جائیں"۔

ماما کو یہ کوسا یقیناً برا لگتا تھا لیکن چونکہ اس کے ستارے طاقتور تھے اسی لیئے اسے کوسا لگتا نہیں تھا۔ ایک عید کے موقع پر اس نے فرمائش کی کہ اسے بالکل ویسی ہی ساڑی چاہیئے جیسی مالکن پہننے لگی۔ مالک تو تیار ہو گئے لیکن مالکن کے وقار کا مسئلہ تھا۔ اس کی فرمائش کو انہوں نے ایک ہی لات میں ٹھکرا دیا۔ اس دل جلی نے مالکن کو یوں کوسنا دیا۔

"خدا کرے اس گھر کا شیر خرما پھٹ جائے"۔

ماما کے دل سے نکلی ہوئی بددعا سیدھی شیر خرما کو جا لگی اور سارا شیر خرما پھٹ کر "شیر قورما" بن گیا۔

کسی گھر میں جب شیر خرما پھٹ کر خراب ہو جاتا ہے تو یہ خبر پاس پڑوس کے گھروں کے علاوہ رشتہ داروں میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ دودھ بھی خراب ہو تو شیر خرما ختم ہونے کے بعد دیر سے آنے والے دوست احباب اور رشتہ داروں کو یہ کہہ کر بہ آسانی ٹہلایا جا سکتا ہے کہ ہم نے دس لیٹر دودھ کا شیر خرما بنایا تھا۔ مگر سارا پھٹ گیا۔ کبھی ایسا بھی

ہوتا ہے یہ شیر خرما اچھا تو بنتا ہے لیکن ناساز گار حالات میں بعد میں خراب ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ ایسا ہی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ایک بڑے افسر کی زیرِ نگرانی ایک ہی احاطے میں دو مختلف ادارے تھے۔ دونوں اداروں والوں نے شایانِ شان عید منانے کے لیے شیر خرما بنانے کا بطور خاص اہتمام کیا۔ ایک ادارے والے خوشی خوشی اپنے افسر کو مدعو کرنے پہنچے۔ پتہ نہیں افسر کا موڈ خراب تھا یا کیا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے ماتحتوں کو بری طرح ڈانٹ دیا کہ میری اجازت کے بغیر تم لوگوں کو ادارے کے احاطے میں شیر خرما لانے کی ہمت کیسے ہوئی۔ اطاعت گزار انتہائی دل شکن ہو کر لوٹ گئے۔ کسی نے بات کا یوں بتنگڑ بنایا کہ افسر کی اجازت کے بغیر دوسرے بھی شیر خرما نہیں پی سکتے۔ شیر خرما کسی نے نہیں پیا۔ افسر صاحب اِدھر ڈانٹ پلا کر اُدھر شیر خرما پینے چلے گئے۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہاں سارا شیر خرما پھٹ چکا تھا۔

نتیجہ:۔ کسی کا دل دکھانا اچھا نہیں ہوتا۔

عید کے دن شیر خرمے کے علاوہ عیدی کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ عیدی دینے والے اپنی استطاعت اور لینے والے کی حیثیت دیکھ کر عیدی دیتے ہیں اکثر والدین عید کی آمد سے ایک ماہ قبل اپنے بچوں کو باقاعدہ تربیت دیتے ہیں کہ جو بھی ملنے آئے خواہ وہ دور کا رشتہ دار ہو یا قریبی دوست، ضد کر کے زبردستی عیدی وصول کریں۔ اور جب تک اس کا ہاتھ جیب کا رخ نہ کرے اس کا شیر خرما حرام کر دیں۔ اس جرمانے سے ڈر کر لوگ آنے والی عید کے لیے ان گھروں پر سرخ خطرے کا نشان لگا دیتے ہیں۔

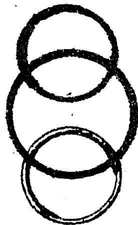
ایک نئے پیش امام کو عید کی نماز سے قبل ایک بڑا مجمع ہاتھ آیا۔ انہوں نے موقع غنیمت جان کر کہنا شروع کیا۔

"آج آپ نماز پڑھنے آئے ہیں مگر آپ کا دل کہیں اور ہے۔ آپ یہ سمجھ رہے

ہوں گے کہ جلدی سے سجدے ملاکو کسی سینما ہال کا رخ کریں گے۔ میں ایسا نہیں ہونے
دوں گا۔ مجھے اتنا بڑا مجمع پھر کبھی نہیں ملے گا"۔
انہوں نے بہت ہی موثر انداز میں حاضرین کے حال پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے آنے والے
کل سے ہوشیار کیا۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔
"آج آپ نہا کر نئے کپڑے پہن کر خود سے چل کر یہاں آئے ہیں۔ کل آپ کو
نہلا کر کفن پہنا کر چار آدمیوں کے کندھوں پر لایا جائے گا۔ آج آپ یہاں سے
خوشی خوشی گھر واپس جائیں گے۔ کل آپ کو یہاں سے شہرِ خموشاں لے جایا جائے گا۔
آج آپ نے اپنے جوتوں کی ڈوریاں اپنے ہاتھوں سے باندھی ہیں۔ کل دوسرے
لوگ آپ کے انگوٹھے باندھیں گے"
اس کے بعد وہ ان نوجوانوں سے مخاطب ہوئے جو چست لباس پہن کر آئے تھے۔ ان کی عید
کی خوشیاں پیش امام صاحب نے اسطرح ملیامیٹ کیں۔
آج کے نوجوان فیشن پرستی میں مگن ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آج آپ اپنے والدین کے منع
کرنے پر بھی ایسا لباس پہن کر یہاں آئے ہیں لیکن یاد رکھیئے کہ کل آپ کو سفید ڈھیلا
ڈھالا لباس پہنا کر یہاں لایا جائے گا۔
بہر حال اس وعظ کو سننے کے بعد لوگوں کا موڈ بن گیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو تیار کر لیا کہ اس سال
تو یہاں سے نکل کر دوست احباب کے پاس جائیں گے۔ آئندہ سال ہو سکتا ہے دوست احباب
پھول نچھاور کرنے آئیں گے۔

وعظ ختم ہوتا ہے لوگوں کی پریشانی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی دوران کسی کی جیب
خالی ہوئی تو کسی کا جوتا غائب ہوا۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے چلتا رہے گا۔ سب خوش خوش اپنے
گھروں کو لوٹتے ہیں۔ عورتیں سج دھج تیار رہتی ہیں۔ انعام کے لئے آنے والوں کا سلسلہ

شروع ہو جاتا ہے۔ رنگ برنگی کشتی پوش پڑی ہوئی کشتیاں ایک گھر سے دوسرے گھر لیجائی جاتی ہیں۔ سڑکوں پر، گلی کے نکڑوں پر لوگ انتہائی گرم جوشی سے گلے ملتے ہیں اور عید کی مبارکباد دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بہرحال عید کے دن کی رونق ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ خدا کرے یوں ہی عید ہر گھر آئے اور ہر سال اپنی بہاریں لٹاتی رہے۔



ہلمٹ

ہلمٹ کب، کیوں اور کس نے بنائی یہ تحقیق طلب موضوع ہے۔ کونسے ممالک میں لازمی ہے اور کونسے ممالک میں اختیاری، اس بات کا سروے کوئی ریسرچ اسکالر ٹھیک ڈھنگ سے کر سکتا ہے۔ بہت دنوں کی خاموشی کے بعد ہلمٹ نے پھر دھوم مچائی۔ جن لوگوں کے پاس پرانی نہیں تھی ان میں سے چند نے خریدلی اور چند لوگوں نے پہلی تاریخ کے آنے تک مختلف طریقوں سے پولیس والوں کو مصروف رکھا۔ پھر سروں کے مقابلے میں ہلمٹس کا تناسب بڑھ گیا۔ ذات پات مذہب فرقہ چھوٹے بڑے غرض کہ من و تو کا فرق مٹ گیا۔ لوگ بے اختیار کہہ اٹھے۔

ہندو مسلم اور عیسائی — لگتے ہیں سب بھائی بھائی

کبھی ایسا ہوا کہ ہلمٹ کی آڑ میں ایک شخص نے دن دھاڑے کسی سے ہزاروں کی رقم چھین لی اور فرار ہو گیا۔ خبر چھپ گئی کہ پولیس کو اس ہلمٹ والے اسکوٹر سوار کی تلاش ہے۔ ہلمٹ اتار پھینکنے کے بعد بھلا وہ کیسے ہاتھ لگ سکتا ہے۔

ہلمٹ کے لزوم سے پہلے ترغیبی مہم کا زور و شور سے چرچا تھا۔ مختلف سروں پر مختلف طریقوں سے ہلمٹ چڑھائی جا رہی تھی۔ کھلے سروں کو روک کر ایک ذمہ دار شخص کہہ رہا تھا۔ "بہن لو میرے بھیا ہلمٹ! یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ سودے سلف کے کام آتی ہے۔ سیکھے ہوئے بیوی کی یک یک اور اس کی فرمائشوں سے بچاتی ہے۔ راستے میں موقع پڑے تو بھیک

کو بھی فراغت دلاتی ہے اور دعوتوں میں تو اس کا بالکل صحیح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہلمٹ کا سب سے بڑا فائدہ یہ بتایا جاتا ہے کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ ہوجائے تو سر سے ٹل جاتا ہے۔ اسکوٹر لاکھ احتیاط سے چلائیے پیچھے سے ٹکر مارنے والے بس یا لاری ڈرائیور کو کون روک سکتا ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ لاری موٹر کو مارتی ہے، موٹر آٹو کو اور آٹو اسکوٹر کو۔ پیدل چلنے والوں کے لیئے کسی کا اجارہ نہیں، انہیں کوئی بھی مار سکتا ہے۔ اسلئے ہلمٹ کا لزوم تو سب سے پہلے پیدل چلنے والوں کے لیئے ہونا چاہیے۔

کچھ دن ایسے بھی گزرے کہ ہلمٹ موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔ لازمی نہیں کی گئی تھی مختلف گوشوں سے اس کی مخالفت کی جارہی تھی۔ نت نئے انداز سے احتجاج کیا جارہا تھا۔ ایک دن اخبار میں لکھا دیکھا کہ اسکوٹر راں ۳۰ ستمبر ۸۶ء کو پگڑیاں باندھ کر "بصیرت کا فقدان کا دن" منانے والے ہیں۔ ہم خوش ہوگئے کہ رنگ ریزوں کا بھلا ہوگا۔ رنگ برنگی پگڑیاں سڑکوں پر اچھلتی نظر آئیں گی۔ ۳۰ ستمبر گزر گیا، بڑی مایوسی ہوئی۔ اسلئے کہ اس دن صرف نو ہی افراد گرفتار کیے گئے۔ ویسے ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ لوگ پگڑیوں میں لیمو بھلادیں اور اسی قسم کی کچھ چیزیں رکھ لیتے تو گرفتاری کی آفت سر سے ٹل جاتی ——

ہلمٹ لازم ہوئی تو کچھ دن شور رہا کہ آئی ایس آئی [ISI] نشان والی ہلمٹ ہی پہننی چاہیے دوسری ہلمٹس کو شمار نہیں کیا جارہا تھا۔ لوگوں نے حسب دستور احتجاج کیا کہ مخصوص نشان والی ہلمٹ کا لزوم کیوں تو پتہ چلا کہ کسی اثر والے منسٹر نے اپنے سالے کے بیروزگار بہنوئی کو روزگار سے لگایا تھا۔ چند برسوں سے ہلمٹ کو کتا بھی نہیں پوچھ رہا تھا۔ یکایک زمانے نے پلٹا کھایا۔ پولیس حرکت میں لائی گئی جرمانے کا خیال آیا تو ایک صاحب نے صبح آفس جانے سے پہلے بیوی کو آواز دی۔ " سنو! جلدی سے میری ہلمٹ تو دینا"۔ بیوی نے کہا۔ " آپ بڑے بے رحم ہیں، ترس کھائیے ان چھوٹے چھوٹے بچوں پر"۔ شوہر سٹپٹا گئے، بولے " میں نہ صرف بچوں پر رحم

نہیں کر رہا ہوں بلکہ تمہیں بھی دل و جان سے چاہتا ہوں اسی لئے تو ہلمٹ پہن رہا ہوں"۔ بیوی نے وضاحت کی "آپ کی عقل ماری گئی ہے" میں ان بچوں کی بات کر رہی ہوں جو آپ کی ہلمٹ میں پروان چڑھ رہے ہیں، بڑے پیارے بچے ہیں، چلو نہ سہی کم از کم چھٹی تو ہو جانے دیجیے"۔

مختلف چیزوں کے بکنے کے مخصوص مقام ہوتے ہیں۔ مخصوص دکانیں ہوتی ہیں جیسے جہذب گھروں کے لڑکے دولت مند گھرانوں میں بکتے ہیں، غریب اور مجبور لڑکیاں سعودی عرب میں بکتی ہیں لیکن ہلمٹ کے بکنے کی کوئی مخصوص دکان نہیں۔ اسپورٹس کی دکان، پرس اور سوٹ کیس کی دکان، کھلونے کی دکان، کرانہ کی دکان، یہاں تک کہ ہلمٹ کی دکان پر بھی ہلمٹ فروخت ہو رہی ہے۔ ایک کرانہ کی دکان پر پلاسٹک کے پیکٹوں میں کچھ چیزیں ٹنگی ہوئی تھیں۔ ایک بچہ دکان پر آیا ایک پاکٹ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "۲۵ پیسے کے تل کے لڈو دو"۔ دکان والے نے اپنی ہتک محسوس کی۔ غصے سے کہنے لگا "یہ کھوکھلا لڈو تمہارے کھانے کے لیے نہیں، تمہارے باپ کے سر کو بچانے کے لیے ہے"۔

جس طرح آٹو سیکل رکشا اور لاریوں کے پیچھے مختلف قسم کے معنی خیز بلکہ ذو معنی اشعار لکھے ہوتے ہیں۔ اسی طرح آجکل ہلمٹ بنانے اور بیچنے والی مختلف کمپنیوں اور ایجنسیوں نے دکانوں پر مختلف اشعار لکھوا رکھے ہیں۔ ایک صاحب دو تین مرتبہ پولیس والوں سے آنکھ مچولی کرنے اور چالان دینے کے بعد ہار مان کر ہلمٹ کی دکان پہنچے۔ ہلمٹس کے سامنے املا کی بے شمار غلطیوں میں ڈوبا ہوا یہ شعر لکھا تھا ؎

میرا وقت مقرر ہے وقت پہ اپنے آؤں گی • ہلمٹ پہنو یا نہ پہنو ساتھ تمہیں لے جاؤں گی

اس شعر سے وہ بے حد متاثر ہوتے جھٹ سے ایک سرخ رنگ کی ہلمٹ خرید کر پہن لی۔ آئینہ میں اپنے چہرے کو پڑھا۔ جلی حرفوں میں لکھا تھا "بڈھا بندر" اس بات کی انہوں نے مطلق پروا

ہنر کی۔ ان کی سادی توجہ دل کو چھو لینے والے اس شعر پر تھی۔ ادھیڑ پن میں کسی غیر خاتون کی طرف سے یہ پہلا بلاوا تھا۔ واہ واہ کہتے ہوئے دکاندار سے پوچھا بڑی اچھی شاعر ہیں کیا تخلص کرتی ہیں؟ جواب ملا "موت"

ایک ملازم سرکار اپنے تین بچوں اور بڑی بیوی کو روزآنہ اسکوٹر پر بیٹھا کر اسکول اور آفس کو چھوڑتے ہیں۔ چھوٹی ماں میٹرک بیوی امور خانہ داری انجام دیتی ہیں۔ اچھے خاصے سر پر لوہے کا شیڈ دیکھکر بچے نے سوال کیا۔ "ڈیڈی! آپ یہ کان ٹوپ کیوں پہننے لگے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "پولیس والوں کا کہنا ہے کہ اسکوٹر سے گروں گا تو میرا سر محفوظ رہے گا" بچے کا سوال تھا ہمارے سروں کا کیا ہوگا ڈیڈی"؟

ویسے ہلمٹ ہے بڑے کام کی چیز۔ ہمارا شعور ذرا سا بھی بیدار ہو جائے تو اس سے بہت سے بامقصد کام لیئے جاسکتے ہیں۔ سر پر ہو تو اوندھی، الٹا کر پلٹا دیں تو کاسہ بن جاتی ہے۔ اردو کے جلسوں میں اس کاسے کا صحیح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایسے معزز حضرات جو بڑے فخر سے اردو کو مادری زبان کہتے ہیں، بڑے بڑے جلسے منعقد کر کے حکومت سے اسکی ناانصافی کا دکھڑا روتے ہیں، اس زبان کے ختم ہو جانے کا مصنوعی اظہار تشویش غم کرتے ہیں، ان کے سامنے یہ کاسہ پھیلا کر کہتی ہوں کہ وہ خدا کے لیئے یہ بات کبھی زبان پر نہ لائیں کہ اردو ختم ہو رہی ہے اس کے بجائے وہ اپنے گریبان کی طرف نظر کریں۔ ان کا بچہ اگر ففٹی ٹو کا ترجمہ "باون" کر سکتا ہے تو میں یقین دلاتی ہوں کہ اردو زبان کبھی ختم نہ ہوگی۔

ہلمٹ کے بارے میں یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ہلمٹ متعلقہ عہدیداروں کی فرض شناسی کی ایک علامت ہے۔ اس کے لزوم میں کتنی صداقت کتنی سنجیدگی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جب موڈ آیا چالان کیا اور جب جی چاہا انجان ہو گئے۔ ہم کہتے ہیں کہ چالان کرنا ہی ٹھہرا تو ان لاریوں کو کریں جو رات دن سڑکوں پر دھوئیں کے بادل بکھیر کر

دندناتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ لوہے کی خطرناک سلاخوں سے بھری ان گاڑیوں کو دیکھیں جو کسی بھی لمحہ کسی راہرو کی زندگی کو موت سے بدل دیتی ہیں۔

ہلمٹ جی کا جنجال ہے۔ اکثر لوگ پہننے کے بجائے اسکوٹر پر ٹانگ رہے ہیں یا بیوی کے ہاتھ میں تھما رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے استعمال میں سلامتی کا تصور کم اور جرمانے کا خوف زیادہ ہے۔ ہلمٹ نہ پہننے والوں کے لیے چالان کیا جارہا ہے۔ چند مخصوص مقامات پر مخصوص وقتوں میں اسکوٹر سواروں کو روکا جارہا ہے۔ بعض صاحبین سفید پوشاک اور سفید ہلمٹ دیکھتے ہی اپنے چکنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اولوں کے خیال سے اسکوٹر کی رفتار تیز کر دیتے ہیں۔ وقتی طور پر اپنے آپ کو بچا کر خوش ہوتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ سڑک کے کھڈے انھیں صحیح سلامت نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ اگر ایماندار عہدیداروں کی نگرانی میں سڑکیں بن جائیں، عوام سڑک کا صحیح استعمال کرنے لگیں تو پھر انشاء اللہ نہ پیدل چلنے والوں کو ہلمٹ کی ضرورت ہوگی نہ اسکوٹر سواروں کو۔
اب رہا ہلمٹ بنانے والوں کے روزگار کا مسئلہ تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ خدا رزاق ہے اسکی طرف سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔



اپنے پڑوسی

ہر مذہب نے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اچھے پڑوسی بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں۔ وہ لوگ انتہائی خوش نصیب ہیں جن کے پڑوسی شریف ہوتے ہیں۔ ورنہ پاس پڑوس کے چار پانچ گھروں میں سے ایک بھی کم ظرف ہو تو سارے لوگوں کی زندگی تلخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جان بوجھ کر لڑائی نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کی فطرت انہیں مجبور کرتی ہے کہ اپنے پڑوسی کو کسی نہ کسی طرح تنگ کریں۔ کالونیوں میں اس قسم کے پڑوسیوں کے بہت سے واقعات دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ ایک دفعہ جبکہ ہم نے گھر تبدیل کیا تھا، گملوں کی حفاظت کی خاطر ان کے اطراف کٹی ہوئی خاردار جھاڑیاں لگادیں اور پڑوسیوں پر واضح کر دیا کہ یہ بالکل عارضی انتظام ہے۔ لیکن دوسرے دن دس بارہ لوگوں کی دستخط کے ساتھ ایک شکایت آفس بھیج گئی کہ پڑوسی کے بچے کے پاؤں میں کانٹے چبھ سکتے ہیں۔ اس لئے فوراً نکال دیئے جائیں — ہم نے پڑوسی سے پوچھا "آپ کا بچہ کہاں ہیں"؟ اس نے جواب دیا۔ "ماں کے پیٹ میں"۔ ہم نے پھر پوچھا "ماں کہاں ہے"؟ — اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "وہ گاؤں میں ہے، ابھی آنے والی ہے، چار پانچ ماہ بعد..... بچے کو جنم دینے کے لیے"!

بعض لوگوں میں تو بالکل چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا شروع ہوتا ہے۔ بات کا بتنگڑ بنتا ہے اور دونوں کورٹ تک جاکر ہی چین کی بانسری بجاتے ہیں۔ کسی گھر میں پڑوسن کی نوکرانی سے جھگڑا شروع ہوتا ہے تو کسی کے پاس بچوں کی آپس کی لڑائی بڑے دن تک پہنچ جاتی ہے۔ بات کچھ نہیں ہوتی فریقین میں سے ایک بھی اگر سوجھ بوجھ سے کام لے تو قصہ وہیں رفع دفع ہو جاتا ہے لیکن لوگ اس کو وقار کا مسئلہ بناکر آگے بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ سنا کہ ایک گھر میں رہنے والی خاتون اوپری منزل سے نیچے کچرا پھینکا کرتی تھی۔ پڑوسن نے ہر طریقے سے اسے اس فعل سے باز آنے کے لئے کہا لیکن وہ کسی طرح مانتی نہ تھی۔ تنگ آکر اس نے اسکا پھینکا ہوا کچرا جمع کرنا شروع کیا۔ پھر ایک پیکٹ میں ڈال کر پڑوسن کی بچی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اسے یہ حرکت بہت ناگوار گزری۔ کچرا پھینکنا تو بند کر دیا لیکن دن میں دو تین بار بلا ضرورت کوٹنا شروع کر دیا۔ کوٹنے پیسنے کی ان ناگوار آوازوں کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ اس لئے کہ وہ اپنے گھر میں، اپنے فرش پر مسل مار رہی ہے۔ دوسرے کے سر کی اسے پروا نہیں

بعض لوگ اپنے بچوں کو کچھ ایسی تربیت دیتے ہیں کہ بچے پڑوسیوں کا صحیح معنوں میں جینا حرام کر دیتے ہیں۔ بچے پڑوسی کو کتنا تنگ کرتے ہیں اس بارے میں وہ ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتے۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ بچوں کی جھوٹی اور غلط شکایت کی جارہی ہے۔ اچھے پڑوسی وہ ہیں جو ذرا سی شکایت ملنے پر اصل بات کو جانیں، بچوں کی غلطی ہو تو فوراً تنبیہہ کریں۔ لیکن اکثر لوگ منع کرنے کے بجائے ان کی حرکتوں سے خوش ہوتے ہیں۔ ایک ایسے ہی بچہ کا ذکر ہے جو مختلف طریقوں سے اپنے قریبی تین چار پڑوسیوں کو تنگ کرتا ہے سب کی آنکھ بچاکر دوسروں کے گھروں میں کاغذ، ٹین کے

ملکوجے کانٹے ڈالنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ موقع ملنے پر وہ گھروں میں جاکر پھول پتوں پر بھی ہاتھ صاف کرتا ہے۔ پڑوسیوں کے گھر کے سامنے کانچ کے ٹکڑے ڈالتا ہے۔ اور جب ان حرکتوں سے جی بھر جاتا ہے تو نظریں بچاکر اسکوٹرس کے ٹائروں میں کیلے بھی چبھا جاتا ہے۔ وہ اور اس کے ماں باپ سر اونچا کر کے چلتے ہیں۔ غالباً وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ ان سے مرعوب ہیں۔ اس لئے کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ ان غیر شائستہ حرکتوں سے محلے والوں کے پاس ان کا جو مقام ہے وہ محلے والے ہی جانتے ہیں۔

بعض پڑوسیوں میں ایک دوسرے کو ستانے کا مقابلہ چلتا ہے۔ ایک صاحبہ کو گانے کا شوق ہے۔ وہ نہ صرف کلاسیکی موسیقی کا روزآنہ دو گھنٹے ریاض کرتی ہیں بلکہ کچھ بچوں کو ساز کے ساتھ گانا بھی سکھاتی ہیں۔ اچھا خاصا گھر میوزک کالج کا سماں پیش کرتا ہے۔ پڑوسن کو گانے سے مطلق دلچسپی نہیں۔ روزآنہ سنتے سنتے اس کے کان پک گئے ہیں، اس لئے جواب میں اس نے ایک فالتو کتا پال رکھا ہے۔ جس کو کم کھلا کے چھوٹی سی رسی سے تنگ باندھ کر رکھتی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ بھونک کر گانے کا صحیح جواب دے سکے۔ لڑائی دو گھروں میں ہے لیکن دوسرے پڑوسی مجبوراً گانا سنتے ہیں اور کتے کی کرخت آوازوں کو بھی بھگتتے ہیں۔ دو پڑوسیوں کے بچوں میں کھیل کود میں لڑائی ہوئی۔ دو چار دن بعد بچے ایسے گھل مل گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا لیکن بڑوں کے دل میں ایک بار میل آجائے تو دھلنا مشکل ہے۔ ایک نے انتقاماً نل کا ایسا بندوبست کیا کہ دوسری کے گھر پانی آنا بند ہوگیا۔ تو تو میں میں، بڑھتے بڑھتے گالی گلوج کی نوبت آگئی دونوں نے ایک دوسرے کی سات پشتوں کو نواز دیا۔ ایک کی چوٹی دوسری کے ہاتھوں میں تھی۔ کئی دنوں لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ تھک کر ایک نے دوسری پر مقدمہ دائر کر دیا۔ دونوں نے مہینوں کورٹ کے چکر کاٹے

اور پھر دس، دس روپے جرمانے پر دونوں سیدھی ہوگئیں۔ یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ دونوں خواتین شریف گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

اکثر خواتین کا اپنے پڑوسیوں کے گھر بہت زیادہ آنا جانا ہوتا ہے۔ وقت بے وقت دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں۔ اور اطمینان سے اپنا وقت گزار کر واپس ہوتی ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتیں کہ خود اگر بیکار ہیں تو ضروری نہیں کہ پڑوسن بھی بیکار ہو۔ بعض خواتین کو گھر گھر کے جائزے لینے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ کئی گھر پھر کر ساری خبریں جمع کر لیتی ہیں پھر مرچ نمک لگا کر اپنی پڑوسن کو سنا دیتی ہیں۔ کسی گھر کی ساس اپنی بہو کو طعنے دیتی ہے تو کسی گھر کی بہو اپنی ساس کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے۔ کسی گھر میں پہلی تاریخ کو میاں بیوی میں زوردار جھگڑا ہوتا تو کسی کے بچے ماں باپ سے باغی ہوگئے ہیں محلے کے یہ سارے راز وہ اپنی پڑوسن کے پاس جا کر ایک ہی بیٹھک میں اگل دیتی ہیں۔ وہ اگر ایسا نہ کریں تو ان کا پیٹ پھولنے لگتا ہے۔

بے وقت آنے جانے کے علاوہ بعض لوگ مہمان کی آمد پر یا کسی وقت بھی کوئی چیز منگوانے کے لئے پڑوسی کا دروازہ بلا تکلف کھٹکھٹا لیتے ہیں۔ ہر ایک کے آرام کا ایک وقت ہوتا ہے اس لئے لوگوں کو چاہیئے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھیں جن سے پڑوسی کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہو۔

ہر گھر میں ٹیلیفون نہیں ہوتا۔ پڑوسی کے ٹیلیفون کا استعمال ضرورت پڑنے پر سبھی کرتے ہیں لیکن لوگوں کو چاہیئے کہ شدید ضرورت کے وقت ہی ٹیلیفون استعمال کریں۔ ایک صاحب صبح ۸ بجے آفس چلے جاتے ہیں گیارہ بجے ان کی بیوی ہمارے گھر آ کر فون کرتی ہیں "راجو پکچر چلنے کے لئے ضد کر رہا ہے دس کا بھی ٹکٹ لیتے آیئے۔ اور کافی ختم ہو گئی ہے میں صبح کہنا بھول گئی! اس قسم کی باتیں کرتے وقت لوگ مطلق نہیں سوچتے کہ پڑوسی کا کتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ

آفس سے شوہر بیوی کو فون کرتے ہیں۔ درمیان میں دو گھر ہوں تو جاکر انہیں بلانا ہوتا ہے وہ بے فکری سے ریڈیو کے ساتھ گاتے ہوئے کپڑے پٹک پٹک کر دھونے میں مصروف ہوتی ہیں۔ بڑی مشکل سے دروازہ کھولتی ہیں انسان بن کر پانچ منٹ بعد فون کرنے آتی ہیں ــ شوہر سے مخاطب ہوتی ہیں۔ ادھر سے آواز آتی ہے "آج کھانا کچھ زیادہ بھیجنا، دہی رکھنا نہ بھولنا، اور ہاں ...... مرچ کم ڈالو ــ میں گھر میں کہنا ہی بھول جاتا ہوں"۔ کبھی فون آتا ہے پڑوسن آکر بات کرتی ہیں، دوسری طرف سے آواز آتی ہے "ہیلو بیگم، میں پوچھنا چاہتا تھا کہ منا پڑھ رہا ہے یا نہیں؟ ایسی ہی شدید ضروری باتوں کے لئے لوگ پڑوسی کے گھر کا فون استعمال کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایسے ہی فون پر ہم نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ "کیا کوئی ضروری بات کہنی ہے، آپ کو"؟ اس وقت یہاں سے کوئی بلانے والا نہیں"۔ جواب ملا ــ جی ۔ جی ہاں ــ ضروری بات ہی تھی ــ میں اپنی بیوی سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس وقت وہ کیا کر رہی ہیں؟ ــ کوئی بات نہیں میں ٹھہر کر پھر فون کرلوں گا"ــ

بہر حال ہر قسم کے پڑوسیوں سے لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ آپس میں تعلقات خوشگوار ہوں تو دونوں ایک دوسرے کے آڑے وقت کام آتے ہیں اور تعلقات بگڑے ہوئے ہوں تو ایک کے گھر امبولنس آجانے پر بھی دوسرا تماشائی بنا دروازے یا کھڑکی سے جھانک لینے پر ہی اکتفا کرتا ہے۔

سولہ برس کا سن

عمر ایک ایسا ساز ہے جسے خواتین بھری محفل میں بیٹھ کر چھیڑتی ہیں۔ صرف عورتیں اپنی عمر چھپانے اور دوسروں کی بڑھا کر بتانے میں خواہ مخواہ بدنام ہیں یہ گر مرد حضرات بھی خوب جانتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اس سے واقفیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک صاحبہ جو تابڑ توڑ جھوٹ بولتی ہیں ۲۰ سالہ لڑکے کی شادی کے وقت انہوں نے اپنی عمر ۳۲ سال بتائی۔ حساب کی ماہر خواتین نے احتجاج کیا کہ آپ بارہ سال کی عمر میں ہرگز ماں نہیں بن سکیں خدا کیلئے اپنی عمر میں چند سالوں کا اضافہ کیجئے۔ انہوں نے اپنی عمر تو نہیں بڑھائی البتہ بیٹے کی عمر یہ کہہ کر کم کر دی کہ اسکول میں شرکت کے وقت زیادہ لکھوائی گئی تھی۔ دانت نزلے سے گر گئے، بال دھوپ میں سفید ہو گئے، بینائی ویڈیو کی لعنت سے کم ہو گئی، ہم تو کہتے ہیں کہ مختلف جواز پیش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ عمر آخر عمر ہے بڑھنا اس کا کام ہے۔ اس قسم کی صفائیاں ہم خواتین کو زیب نہیں دیتیں۔ یہ سوچ کر صبر کرلینا چاہیئے کہ مہنگائی کی طرح عمر پر بھی ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ بعض لوگ کرفیو کی طرح غیر معینہ مدت تک کرسی پر جمے رہنے کے لئے سولہ برس کے سن میں سولہ برس رہنا چاہتے ہیں جونیرس عہدوں سے سبکدوش ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن سینیرس عمر کو برسوں روکے رکھنے کے گر سے واقف رہتے ہوئے اپنی کم عمری کے مختلف ثبوت مختلف وقتوں میں

میں دیتے رہتے ہیں

بعض خواتین ضرورت سے زیادہ ہوشیاری بتانے کے لیئے خود سے کم عمر ہم جماعتوں کا بار بار حوالہ دے کر بھیڑوں میں ملنا چاہتی ہیں ۔ بس اسٹانڈ پر ایک صاحبہ نے دو چار آمنوں سامنوں کے بعد ضروری سمجھا کہ منہ کھولا جائے ۔ انہوں نے گریجویشن کا سنہ پوچھا ۔ پھر تعجب میں بناوٹ گھول کر کہا ' "SO SO Senior" میں اتنی شدت تھی کہ زوردار سیٹی بج گئی ۔ قریب کھڑے ہوئے چند نوجوانوں میں حرکت پیدا ہوئی ۔ لیکن جیسے ہی سیٹی کی قدامت سمجھ میں آگئی ایک نے ان سے مخاطب ہو کر کہا " آنٹی آپ تو سیٹی اچھی بجالیتی ہیں " ۔ یہ صاحبہ ہر لحاظ سے سینئر ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ میٹرک کے بعد چند سال انہوں نے کالج کی صورت نہیں دیکھی ہوگی یا پھر ہر سالانہ امتحان کے وقت امتحان ہال کے بجائے میٹرنٹی ہوم کا رخ کرتی ہوں گی

تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شادی کے وقت عمر کا سوال کھل کر سامنے آتا ہے ۔ لڑکے والے میٹرک سے لے کر تعلیم کے سارے مدارج طے کر کے صحیح عمر تک پہنچ جاتے ہیں ۔ آجکل تو جہیز کی فہرست کے ساتھ مشاطہ میٹرک کے سرٹیفکیٹ کی کاپی بھی مانگنے لگی ہے ۔ رشتہ ناپسند ہو تو اپنی طرف سے دو چار سال کا اضافہ ہی کر لیتے ہیں اور اگر پسند ہو تو پانچ دس سال زیادہ عمر والی لڑکی کو بھی بخوشی قبول کر لیتے ہیں

" سر بڑا سردار کا " والی کہاوت تو آپ نے سنی ہوگی ۔ حال ہی میں ایک صاحبہ نے ایک خطرناک بات بتائی کہ بڑے کانوں والے لوگ طویل عمر پاتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے پڑوس کی مثال دی کہ اس خاندان کے اکثر لوگ ۱۰۵ سال سے پہلے دنیا کو چھوڑنے کا نام نہیں لیتے ۔ ۹۰ سالہ آدمی کا تصور یہی ہوتا ہے کہ وقت پر کھاتا پیتا اللہ اللہ کرتا ہوگا ۔ اس گھر کے ۹۰ سالہ چاچا کا زیادہ وقت جام کے درخت کی ڈالیوں پر گزرتا ہے " چاچا جام

پھینکنے " اس آواز کے وہ منتظر رہتے ہیں۔ پڑوس میں رہنے والی اس ادھیڑ بھتیجی کو وہ
کس نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ ان کی عینک ہی بتا سکتی ہے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ کم از کم مرحوم کی
عمر صحیح بتائیں۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ کسی کے انتقال کی خبر باتصویر شائع ہوتی ہے تو تصویر
دیکھ کر اجنبی لوگ کہتے ہیں کہ بیچارے کی بے وقت موت ہوئی یا ان کی عمر مرنے کی نہیں تھی
اول تو موت کے ساتھ لفظ بے وقت کا استعمال ہی سراسر غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ بعد میں
پتہ چلتا ہے کہ جان بوجھ کر جوانی کی تصویر شائع کی گئی تھی تاکہ مرنے کے بعد بھی لوگ
ہمدردی کریں۔ دوسروں کو دھوکہ دے کر ہمدردی سمیٹنے کا یہ بھونڈا انداز شریف
متعلقین کو زیب نہیں دیتا۔ ہمارا تو یہ ایقان ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں سچ بولنا
چاہیئے۔ خواہ بات عمر کی کیوں نہ ہو۔ انسان کی جہاں عمر بڑھتی ہے اس کے وقار کا بھی
ثبوت ملتا ہے۔ بعض خاص حالات میں طویل عمر کا ریکارڈ قائم کرنے کے لئے کسی مریض کی
عمر راؤنڈ فیگر کرکے ۹۵ سے ۱۰۰ کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ چند ماہ قبل ایک ایرانی بڑھے کی
عمر اس کی موت اور زیست کی کشمکش کے دوران ۹۵ سے ۱۰۰ برس کر دی گئی۔ یہ بتانے کیلئے
کہ وہ اتنی بڑی عمر میں بھی موت سے ڈٹ کر پنجہ لڑا رہا ہے۔ مرنے کی عمر کے علاوہ ایک
سرکاری عمر بھی ہے جو کسی انسان کے عہدے پر رہنے اور کام نہ کرنے کے لئے بتائی گئی
ہے۔ کبھی ایسا ہوا کہ صبح کسی نے اخبار ہاتھ میں لیا اور اسے پتہ چلا کہ بیٹھے بیٹھے وہ
۵۸ سے ۵۵ سال کا ہوگیا۔ یہ خبر پڑھنے کے بعد وہ حاکموں کی بات رکھنے کے لئے
سچ مچ ۵۵ سال میں دنیا سے منہ موڑ لیتا ہے۔ سینیارٹی اور قابلیت کی بنیاد پر
ترقی دینا ہر ایماندار حاکم کا فرض ہے۔ اس لئے کہ متعلقہ شخص کی عمر کا ایک ایک لمحہ قیمتی
ہوتا ہے۔ جہاں کھلی دھاندلی اور ناانصافی ہوتی ہے وہاں اچھے اچھوں کو درخواست
ہاتھ میں لے کر دم توڑتے بھی دیکھا گیا ہے۔

بھائی لوگ بیوی کے علاوہ سکریٹری ، نوکرانی اور اسی قسم کے مختلف کاموں کے لئے عورت کا انتخاب کرتے وقت اس کی عمر ضرور دیکھتے ہیں۔ میں اس مرد کو شاباشی دیتی ہوں جو آبرو ریزی کے لئے ۵ ماہ کی لڑکی کا انتخاب کرتا ہے اور باقی بھائیوں کو ایوارڈ کا مستحق سمجھتی ہوں جو جھوٹے منہ ہی سہی، کوئی جلوس نکالتے ہیں نہ بیان بازی کرتے ہیں۔ سوچتے ہوں گے ، ہمیں کیا پڑی ہے ؟ ہوگی کسی کی لڑکی ۔ وہ بھی صرف ۵ ماہ کی۔ رہیں بڑی اور منجھلی کرسیاں تو انہیں ان معمولی، چھوٹی چھوٹی باتوں سے کیا دلچسپی۔ ان کے ذمہ بہت سے بڑے بڑے کام ہوتے ہیں۔

آخری بات ۔ بیوی تو ایک ہوتی ہی ہے۔ معزز حضرات دوسری عورتوں کی بھی گر کر، عزت کریں ٹوٹ کر چاہیں، ماں بہن اور بیٹی کے روپ ہیں۔ اگر ایسا ہوگا تو ان کے گھر کی عورتوں کی بھی وہی عزت ہو گی۔ چاہے وہ کچی کلیاں ہو یا کچی بیٹی یعنی عورت، عورت ہے خواہ کسی عمر کی کیوں نہ ہو۔ اس کی عمر اور عورت پن کا استحصال نہ ہو، میں یہی چاہتی ہوں ۔۔۔۔ ●●

باہر کا دولہا

آدمی ہندستان کا ہو یا کسی اور دیس کا، گلے میں ہار ڈالے پھولوں سے سجی موٹر میں بیٹھ کر جب کسی لڑکی کے گھر جاتا ہے تو وہ دولہا کہلاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اپنے دیس کا ہوگا تو صرف دولہا پکارا جائے گا۔ دیس کا نہ ہو تو باہر کا دولہا ہوگا۔ باہر کے دولہے دو وضع کے ہوتے ہیں۔ ایک مستقل وہیں کے رہنے والے، دوسرے وہ جو اپنے ملک سے تلاش روزگار کی فکر میں نکلتے ہیں۔ انہیں باہر سب کچھ مل جاتا ہے۔ سوائے دلہن کے۔ اور اسی کی تلاش میں پھر اپنے ملک آتے ہیں۔ مستقل باہر رہنے والوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اچھی خصلت والے، بدخصلت والے۔ آجکل ہمارے دیس کے لوگوں کو ان دونوں قسم کے لوگوں سے بہت زیادہ سابقہ پڑ رہا ہے۔

مستقل باہر رہ کر آنے والے دولہے کی خوبی یہ ہے کہ وہ لڑکی والوں سے کسی قسم کی فرمائش نہیں کرتا بلکہ پوچھ پوچھ کر دیتا ہے کہ تمہیں کیا چاہیئے۔ سسرال اور سسرال کے قریبی رشتہ داروں کے گھروں میں لائٹ لگوا دیتا ہے۔ ٹی نہیں تو اس کا بھی معقول بندوبست کر دیتا ہے کپڑے لتے اور دولت کی بارش سے گھروں کا رنگ ہی بدل دیتا ہے۔ لیکن اگر بدخصلت ہو تو لڑکی کے ساتھ اس گھر کی ساری خوشیاں چھین لے جاتا ہے۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب لڑکی کے مجبور والدین اس کے بارے میں تحقیقات ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے پاس مانگنے والوں

کو دینے کے لئے کچھ بھی تو نہیں ہوتا وہ صرف اس کی جیبوں کو دیکھتے ہیں جو ڈالرس سے بھری ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ ہاتھ پھیلا کر مانگتے ہیں۔ یہ ہاتھ اٹھا کر روپیہ تقسیم کرتا ہے۔ ایک ماہ عیش کر کے واپس چلا جاتا ہے، اس وعدہ پر کہ جاتے ہی لڑکی کو بلالے گا۔ جاتے وقت وہ ملی جلی عربی اور اردو میں روتا ہے۔ یہ دکھانے کے لئے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی دلہن کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر وہ ایسا بن جاتا ہے جیسے ہندستان آیا ہی نہیں تھا اور اگر آیا بھی تھا تو لفظ "شادی" سے اسے کوئی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ دوسری صورت میں لڑکی کو لے کر بھی جاتا ہے تو وہاں پہلے سے اس کی سوت موجود رہتی ہے۔ بعض مجبور اور کم عمر لڑکیاں تو اس کی عادی ہو چکی ہیں۔ ان کے ماں باپ بظاہر خوش نظر آتے ہیں کہ لڑکی کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہوئے اور گھر کا افلاس بھی گیا۔ ماہانہ آنے والے ڈرافٹ ہی ان کا سرمایہ زندگی ہوتے ہیں۔ دنیا والوں کو دکھانے کے لئے وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں لیکن ان والدین اور لڑکیوں پر جو گذرتی ہے وہ ان ہی کا دل جانتا ہے۔

باہر سے آنے والے دولہے کی دوسری قسم وہ ہے جو اپنے وطن میں تعلیم پا کر روزگار کی فکر میں باہر جاتا ہے۔ وہاں جا کر وہ اپنے دیس کی بے فکری کی زندگی اور ٹھاٹ باٹ سب بھول جاتا ہے۔ وہ مشینی زندگی گذارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شادی بھی انتہائی عجلت میں کرتا ہے۔ وہ اخبار میں اشتہار دلواتا ہے کہ صرف وہی لوگ رجوع ہوں جو پندرہ دن میں شادی کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ لڑکی والوں کو غیر ضروری دریافت کے چکر میں پڑنے کا بالکل موقع نہیں دیتا۔ ایک ماہر مشاطہ کے ذریعہ سرسری معلومات لینے کے بعد ایک گھرانے میں ایک لڑکے کا رشتہ طے ہو گیا۔ یہاں تک کہ نکاح کا دن آپہنچا۔ شادی خانے میں دھوم تھی دلہا دس کیلو وزنی پھولوں کا سہرا باندھے شان سے موٹر سے اترا۔ ایک چھوٹے لڑکے نے تاکا کہ دولہا لنگڑا ہے۔ لڑکی والے بدل گئے۔ جواب طلب کیا گیا۔ دولہا تو بے چارہ دولہا

تھا۔ اس سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ وہ موٹر کے پھول اور گلے کا ہار اپنے والد کے منہ پر پھینک کر واپس چلا گیا۔ ادھر لڑکے کے والدین سے دھوکہ دہی کی وجہ پوچھی گئی تو اُلٹے برس پڑے کہ ہم نے کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ رہا لڑکے کے لنگڑے پن کا سوال تو سچ یہ ہے کہ آپ پوچھے نہیں ہم بولے نہیں۔ بڑی مشکلوں سے براتی دلہن والوں کی طرف سے آئے ہوئے بے قصور مہمانوں سے لڑ جھگڑ کر واپس ہو گئے۔ آٹھ دن بعد باہر سے آئے ہوئے اس لنگڑے دولہے کی دوسری لڑکی سے خیر خوبی کے ساتھ شادی ہو گئی۔ خوش قسمتی سے یہاں جوڑے کی رقم بھی کچھ زیادہ ہی ملی، لڑکی کی صرف ایک آنکھ خراب تھی اور اونچا سنتی تھی۔ لنگڑے دولہے کے باپ نے دھوکہ دہی کا الزام لگایا۔ لڑکی والوں کا صاف جواب تھا۔ "آپ پوچھے نہیں، ہم بولے نہیں، قصہ ختم"۔ اس شادی سے کم از کم ان لوگوں کو آئندہ کے لئے سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ شادی بیاہ لین دین کے معاملے میں صاف اور کھل کر بات چیت کریں۔ روپیہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ کبھی کسی ایک کے پاس رہنے والا نہیں۔ لڑکے والوں کو بھی یہ سوچنا چاہیئے کہ اگر وہ ہزاروں کی رقم طلب کریں گے تو لڑکی کے مجبور والدین کہاں سے دیں گے۔ آج کل تو ایک قسم کا مقابلہ سا چل رہا ہے۔ اکثر سرپرست جن کے پاس کثیر دولت جمع ہے خواہ وہ حرام کی ہو یا حلال کی، پیشکش کرتے ہیں کہ پچیس ہزار روپے جوڑے کے دیں گے۔ پندرہ تولے سونا دیں گے اور لڑکا چونکہ باہر ہے اس لئے مزید پندرہ ہزار روپے فرنیچر وغیرہ کے لئے دیں گے۔ یہ لوگ لڑکے والوں کی عادتیں بگاڑ رہے ہیں اگر لڑکی والے بلکہ خود لڑکیاں مصمم ارادہ کر لیں کہ باقاعدہ مانگنے والوں کا بائیکاٹ کریں گی تو بہت جلد سماج سے جوڑے گھوڑے اور جہیز کی لعنت ختم ہو سکتی ہے۔

آج کل بہت سے لڑکے ملک سے باہر ہیں ان کے والدین جو یہاں ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا لڑکا چونکہ بہت زیادہ دولت کما رہا ہے اس لئے اسی تناسب سے لڑکی والوں سے جوڑے کی رقم کا مطالبہ کرنا چاہیئے۔ بعض صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ لڑکی والوں سے لی گئی یہ رقم اور اس کے حساب کتاب سے لڑکا قطعی ناواقف رہتا ہے۔ وہ اس رقم کی پرواہ اس لئے نہیں کرتا کہ وہ خود بے حساب دولت کا مالک رہتا ہے۔ جوڑے کی رقم کا مطالبہ لڑکا نہیں کرتا بلکہ اس کے والدین خصوصاً مائیں کرتی ہیں۔ انہیں روپے کی ایک ہوس سی ہوتی ہے۔ ہر طرف کا روپیہ بٹورنا چاہتی ہیں۔ لڑکے سنجیدگی سے اپنی ماؤں کا بائیکاٹ کریں جو جوڑے کے نام پر ہزاروں کی رقم لڑکی والوں سے لیتی ہیں۔ اور ایک معنوں میں اپنے لڑکوں کو بیچتی ہیں۔ اس بائیکاٹ کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی ماؤں کو تنبیہہ کر سکتے ہیں، جوڑے کے نام پر رقم لی جائے گی تو وہ انہیں بنک ڈرافٹ بھیجنا بند کردیں گے۔

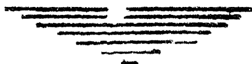
صحت مند فقیر کسی کے در پر جا کر بھیک مانگتا ہے تو لوگ غصہ میں آکر طنزیہ کہتے ہیں کہ ہٹا کٹا ہے مگر بھیک مانگ رہا ہے۔ میرے نزدیک ایسے لوگ ان فقیروں سے بدتر ہیں جو علانیہ اخبار میں اشتہار دے رہے ہیں کہ ایسی لڑکی کو ترجیح دی جائے گی جس کے والدین لڑکے کو باہر بھجوانے کی پوری ذمہ داری لے سکیں۔ ایسے لوگ سماج کے نام پر بدنما داغ ہیں۔

مختلف مقامات سے ایسی اطلاعات مل رہی ہیں کہ لڑکی کو اس کے سسرال والوں نے محض اس لئے کیروسین ڈال کر زندہ جلادیا کہ وہ جہیز کم لائی تھی۔ یا جتنے مطالبات ان لوگوں نے کئے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ کیروسین ڈال کر نہ بھی جلائیں تو بعض سسرال والے لڑکی کو طعنے دے دے کر زندہ درگور کر دیتے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا

آجاتا ہے کہ وہ اِن لوگوں کی بدسلوکی اور طعنوں کی تاب نہ لاکر خودکشی کر بیٹھتی ہے۔

بہرحال سماج کی بڑھتی ہوئی اس لعنت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کو ختم کرنے میں خوشحال لوگوں کو تھوڑی سی فراخدلی سے کام لینا ہوگا۔ خصوصاً وہ لڑکے جو ہندستان سے باہر ہیں ان کے سہرے کے پھول جب کھلیں تو وہ حسبِ استطاعت کچھ رقم ایسی مستحق لڑکی کے لئے ضرور دیں جس سے اس کے ہاتھوں کو بھی مہندی لگ سکے اور دوسری خوشحال لڑکیوں کی طرح اس کا گھر بھی بس جائے۔





ہزاروں خواہشیں ایسی

ہر انسان کے دل میں کچھ نہ کچھ خواہشیں ضرور ہوتی ہیں۔ یہ اور بات کہ قسمت ساتھ دے تو انسان کی ہر خواہش پوری ہوتی ہے۔ اور اگر پیدائشی قسمت پھوٹی ہو تو خواہشوں کے لئے وہ اس دنیائے فانی سے خاموش چلا جاتا ہے۔ ایک صاحبہ کی خواہش ہے کہ وہ کبھی نہ مریں۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو وہ موت سے ڈرتی ہیں، دوسرے یہ چونکہ وہ دس سال سے ساٹھ سال پار کر چکی ہیں۔ اس لئے ان کی عمر ابھی مرنے کی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی ایک رازدان سے کہہ دیا کہ اتفاقاً اگر وہ مر بھی جائیں تو مرنے کے بعد کم از کم دس گھنٹے ویسے ہی رکھا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ دس بارہ گھنٹے بعد سانس پھر واپس آسکتی ہے۔ انہیں اطمینان دلایا گیا ہے کہ ان کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ وہ بے فکری سے اپنی جان دے سکتی ہیں۔ اس لئے کہ تجہیز و تکفین کا انتظام ہونے اور دوست احباب، رشتہ داروں کو اطلاع دیتے تک دس گھنٹے گزر ہی جاتے ہیں۔ ان کی بعض عجیب و مضحکہ خیز خواہشات کی تفصیل سن کر ایک انجان آدمی یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ محض لوگوں کی مسلسل توجہ اور ہمدردی حاصل کرنے کے لئے وہ کبھی اندھی بن جاتی ہیں تو کبھی لنگڑی۔ وہ کیا سوچتی ہیں، کیا چاہتی ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ان کی ہمیشہ یہی خواہش رہتی ہے کہ وہ بیمار نظر آئیں روزانہ دو چار لوگ ان کی مزاج پرسی کو آتے رہیں، وہ تندرست ہیں چلتی پھرتی ہیں پھر بھی وہ چاہتی ہیں کہ بیمار کہلائیں۔ لوگوں کی ہمدردی سمیٹنے کے لئے وہ گرنے کی بھونڈی ایکٹنگ

کرتی ہیں پھر اس کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں، اس پر بھی توجہ نہ ملے تو وہ لنگڑا کر چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ لیکن یہ چال کو دھیما کرنا بھول جاتی ہیں۔ اپنے آپ کو اندھا ظاہر کرنے کی خواہش میں وہ سامنے رکھی چیزوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتی ہیں۔ پھر تنہائی میں سب کی نظریں بچا کر پیسے گنتے وقت وہ بھول جاتی ہیں کہ انہوں نے جس چیز کی خواہش کی تھی اس کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ ایسی صورت میں دیکھنے والے ان پر فقرے کستے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی خواہشیں پوری کرنی ہوں تو کم از کم پونا انسٹی ٹیوٹ میں کچھ عرصہ رہ کر ایکٹنگ سیکھ لیں تاکہ جگ ہنسائی نہ ہو۔

بہو کی تلاش میں نکلنے والی خواتین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے گھر بہو بن کر آنے والی لڑکی میں تمام گن موجود ہوں یعنی مالدار، دراز قد، خوبصورت، نیک سیرت، پڑھی لکھی اور صوم وصلوٰۃ کی پابند۔ پریوں جیسی بہو کی خواہش رکھنے والی ساس کے لڑکے کو دیکھیں تو وہ ہوگا توے کے پیچھے کا چاند، منہ کھولے گا تو ایک دانت بھی صحیح جگہ پر نہ ہوگا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ وہ خوبصورت بیوی کو حاصل کر ہی لیتا ہے۔ ایسے جوڑے کو دیکھ کر دو دھ پیڑے اور مکوڑے کا خیال ایک ساتھ آتا ہے۔ میری ایک دور کی رشتہ دار کہہ رہی تھیں کہ اپنے لئے ایسا داماد ڈھونڈ رہی ہیں جو جاذب نظر، لکھ پتی اور اکلوتا ہو۔ اور کم از کم دو موٹریں رکھتا ہو۔ تاکہ ان کی بیٹی جس وقت چاہے میکے آسکے۔ ایک سال بعد اتفاق سے ان کے گھر دوبارہ جانا ہوا۔ ایک چیچک زدہ، پست قد آدمی آٹو والے سے جھگڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوا معلوم ہوا کہ وہ ان کا مثالی داماد تھا۔

ایک صاحبہ کو الٹیاں ہوتی تھیں اور وہ نڈھال ہو کر گرتی جاتی تھیں، انہوں نے ٹھیک سے وضاحت تو نہیں کی کہ انہیں جو الٹیاں ہوتی تھیں وہ ہاضمہ کی خرابی سے ہوتی تھیں یا لال تکون کو انہوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ بہرحال جو بھی ہو، ان کی خواہش تھی کہ انھیں الٹیاں ہوں اور نئی نویلی بہو ان کو سنبھالے اور فرش وغیرہ کی صفائی کرے۔ بہو کو لال تکون دیکھنے کی ابھی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ ساس کی خطرناک حالت دیکھ کر بہو قریب آنے کے بجائے دور بھاگنے پر مجبور تھی۔

بہو نے ساس کی خواہشوں پر پانی پھیر دیا تو ساس نے ایک ماہ میں اعلان کر دیا کہ بہو نافرمان اور گستاخ ہے۔ اب یہ حال ہے کہ وہ اسکی صورت سے نفرت کرنے لگی ہیں۔ بیٹے کو مشورہ دے رہی ہیں کہ بیوی تو دوسری مل سکتی ہے، جنم دینے والی ماں کا بدل ناممکن ہے۔ اس نافرمان بہو کو فوراً طلاق دو اور میری پسندیدہ خدمت گذار بہو لے آؤ۔ میری خواہش پوری نہ کرو گے تو میں دودھ نہیں بخشوں گی۔ اولاد کا نگ خواہشات کی عدم تکمیل پر دودھ نہ بخشنے کی دھمکی! یہ کتنی بے تکی اور بے جان دھمکی ہے۔ ڈبے کا دودھ پینے والے بچوں کو ماں کا دودھ بخشوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دولت پر دم دینے والوں کی خواہش بھی قابل ذکر ہے۔ روپیہ جن لوگوں کی کمزوری ہوتا ہے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ جب تک زندہ رہیں کم سے کم خرچ میں اپنا گزارہ کریں۔ اور روپیہ سنبھال کر رکھیں۔ ایک صاحب تھے جنہیں دولت سے والہانہ محبت تھی۔ بچوں پر روپیہ تو خرچ کرنا بہت دور کی بات ہے وہ اپنی غذا اندر دوا پر بھی خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ سنا ہے کہ ان کی بیماری کے زمانے میں ان کی بیٹی اور نواسا نواسی کچھ دن کے لئے ان کے گھر گئے تو وہ اس فکر میں دبلے ہونے لگے کہ گھر میں دال چاول کے ڈبے خالی ہو رہے ہیں۔ طاقت کے لئے ڈاکٹر نے انہیں سیب کھانے کی تاکید کی تھی۔ پیسے کی بچت کی خاطر وہ دن بھر میں بمشکل سیب کے دو تین ٹکڑے کھاتے تھے۔ صبح اٹھتے ہی کالے دھن کو دیکھ لیتے اور جی ہی جی میں خوش ہوتے۔ ایک دفعہ بارش کا پانی گھر میں داخل ہو گیا سارے نوٹ بھیگ گئے۔ کئی دن ان کا مشغلہ رہا کہ روزانہ سامنے بیٹھکر اپنی نگرانی میں نوٹ خشک کرواتے اور رکھوا دیتے۔ میرا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کی تمام خواہشات ختم ہو جاتی ہیں۔ صرف یہی ایک خواہش مرتے دم تک ان کا ساتھ دیتی ہے کہ روپیہ جمع رہے۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہیں۔ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کا دم بھی مشکل سے نکلتا ہوگا کیونکہ وہ آخری سانس تک یہی سوچتے ہوں گے کہ مرنے کے بعد ان کی جمع شدہ دولت کا کیا ہوگا۔ جو لوگ Sadism کا شکار ہوتے ہیں وہ عجیب مضحکہ خیز خواہشوں کو دلوں میں لئے

زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بے بس بے کس مصیبت زدہ کہلائیں۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے وہ سر پر کنبہ رکھتے ہوئے بھی روتے پھرتے ہیں کہ ان کا کوئی نہیں، اولاد کی بہت زیادہ اطاعت گذاری کا استحصال کرتے ہوئے بھری محفلوں میں اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی موت مٹی اولاد کے پیسوں سے نہ کی جائے۔ ان سے یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ زندگی میں جو کھایا پیا وہ کدھر گیا۔

چلتے چلتے میں اپنی خواہشات کا بھی ذکر کر دوں، میری دلی خواہش ہے کہ مذہب کے نام پر فساد نہ ہو۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہمیشہ برقرار رہے۔ اس خواہش کو پوری ہوتے دیکھ کر میں پھولے نہیں سماتی۔ کبھی کبھار تخریب کار عناصر مذہب کی آڑ لے کر، فساد برپا کروانا چاہتے ہیں تو میں ان قبرستانوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہوں جہاں دو مختلف مذاہب کے لوگ برابر میں مدفون ہیں۔ برسوں کا ساتھ ہے، یہ کہیں جھگڑا کھڑا نہیں کرتے۔ میری خواہش ہے کہ جوڑے کی رقم اور جہیز کی فہرست کا مطالبہ کرنے کی لعنت بالکل ختم ہو جائے۔ اور کوئی لڑکی اس مجبوری کی وجہ سے کنواری نہ رہے۔ میری یہ بھی خواہش کہ خدا مجھے اتنا دے کہ میں کسی مانگنے والے کو خالی ہاتھ نہ لوٹنے دوں۔ ذرا سے ردوبدل کے ساتھ یہ شعر ہمیشہ میری زبان پر رہتا ہے ؎

دیتی ہی چلی جاؤں ہر شخص کو جو مانگے   تو اپنے خزانے سے یارب مجھے اتنا دے

کبھی کبھی دل میں بے تکی خواہش گھر کر لیتی ہے۔ علی الصبح اخبار ہاتھ میں لیتے ہی میں دیوانہ وار صفحے اُلٹنا شروع کر دیتی ہوں کہ کہیں میرا نام پڑھنے مل جائے۔ میری خواہش ہے کہ میں اپنی موت کا تماشا دیکھوں۔ جلی حرفوں میں اپنے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھوں۔ مختلف لوگوں کو مختلف انداز سے اپنی موت پر آنسو بہاتے دیکھوں پھر..... دوسرے ہی لمحے مجھے خیال آتا ہے کہ بھلا یہ بھی کوئی خواہش ہے جو زندگی میں پوری ہو سکتی ہو۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے مجھے بہادری سے مر کے بتانا ہوگا۔ فی الوقت تو مجھ میں یہ ہمت نہیں ہے اس لئے انجان ہو جانا ہی بہتر ہے۔

--

خوش رہنا بھی ایک فرض ہے

ڈاکٹر خواجہ عبد الغفور لکھتے ہیں

تیونس کے صدر حبیب بورقیبا کا قول ہے۔

" جو انسان اپنے پر ہنس سکتا ہے وہی خوش و خرم رہ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہنسنے کے مواقع کی اس کے لئے کوئی کمی نہیں"۔ انسان کو حیوان ظریف کہا جاتا ہے۔ ظرافت اور خوش طبعی کے بغیر انسانی زندگی کے مکمل ہونے کے بارے میں سوچنا بہت بڑی غلطی ہے۔ جن لوگوں کی زندگی سکونِ دل اور خاطر جمعی کے ساتھ گزرتی ہے وہ نہ صرف اپنے آپ سے خوش رہتے ہیں بلکہ خوش کلامی ان کا شعار ہوتا ہے۔ خوش رہنے کے لئے انسان کو زندہ دل رہنا ضروری ہے۔ میں ایک صاحب کو جانتی ہوں، خدا ان کی عمر دراز کرے، دس سال بعد عمر کے سو سال پورے کرنے والے ہیں انتہائی ہنس مکھ اور زندہ دل ہیں ــ وقتے خوش گزرے ان کا مسلک ہے۔ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے تاش کے پتے جمائے، ریڈیو پر فلمی گانے لگائے مست پڑے رہتے ہیں۔ وقت پر عبادت، وقت پر کھانا، کوئی ملنے آجائے تو ایسی خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں، ایسی باتیں شروع کر دیتے ہیں کہ گھنٹوں بیٹھے رہیں وقت کا پتہ نہ چلے۔ گزشتہ سال انہوں نے بذریعہ ریل پاکستان کا سفر کیا۔ واپسی پر ملاقات کے دوران میں نے کہا آپ ضعیف و ناتواں ہیں، ریل کا سفر تکلیف دہ ہوتا ہے، آپ کو چاہیئے تھا کہ ہوائی جہاز سے جاتے کچھ ہی دیر بعد میں نے یاد دلایا " آپ کے بچے اللہ کے فضل سے اچھے عہدوں پر فائز ہیں

وہ ٹکٹ کا انتظام کر سکتے تھے۔" اس پر انہوں نے زوردار قہقہہ مارا کہنے لگے۔" وہ اور ہوائی جہاز کا کرایہ، ان لوگوں نے تو مجھ سے میری سوزنی چھین لی"۔ ان کی ایک ضعیف سالی ہیں۔ باتوں باتوں میں ان کی بیماری اور چلنے میں معذوری کا ذکر آیا۔ کہنے لگے "اسی لئے میں کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے نکاح کر لیں، ضعیفی کا سہارا بنوں گا لیکن مانتی ہی نہیں"۔ ان کی دلچسپ باتیں سن کر بیوی بھی لطف اندوز ہوتی ہیں۔

کسی انسان میں قنوطیت ہو، ماحول سے برہمی ہو تو وہ مسلسل دنیا سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کی جلی بھنی صورت دوسروں کو دنیا سے بیزار کر دیتی ہے اس کے ہر جملے میں زہر مضمر ہوتا ہے۔ کوئی کسی کو دعا دیتا ہے تو یوں کہتا ہے "سدا خوش رہو" یا "خدا تمہیں خوش و خرم رکھے"۔ لیکن یہ دعا اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جبکہ دعا پانے والا واقعی خوش رہنا پسند کرے۔ چڑچڑا، بدمزاج انسان نہ خود خوش رہتا ہے نہ دوسروں کو خوش رکھ سکتا ہے۔ حد یہ کہ وہ کسی کو خوش دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اس قسم کے لوگوں کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ گھر میں کوئی مہمان آئے تو اس سے ایسے جلے کٹے پن سے پیش آئیں گے کہ وہ دوبارہ آنے کا نام نہ لے۔ گنڈاپیٹ تفریح کے لئے جائیں تو منہ پھلا کر بیٹھ جائیں گے اور سارے لوگوں کی خوشیوں پر گنڈا پیٹ کا پانی پھیر دیں گے۔ صبح سویرے ایسے لوگوں کی افلاس بھری صورت پر نظر پڑے تو سارا دن کوفت میں گزر جائے۔ مکان بنانے والے، نل لائٹ والے سے لے کر کام کرنے والے کو کوستے سنانا ان کا معمول ہوتا ہے۔ ہمیشہ بھنّائے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ کھاتے پیتے اور روتے کے روتے رہتے ہیں۔ وہ نہیں جاننا چاہتے کہ خوش رہنا کس چڑیا کا نام ہے۔ وہ بھلے، ان کی بدمزاجی بھلی، دوسرے جائیں بھاڑ میں۔

جو لوگ خوش دل ہوتے ہیں وہ ہر محفل میں سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں۔

پڑوسی، رشتہ دار، دوست احباب سبھی ان سے ملنے کے آرزومند ہوتے ہیں خوش طبع آدمی کسی محفل میں پہنچ جائے تو وہ اپنے مخصوص شگفتہ انداز سے محفل میں جان ڈال دیتا ہے۔ شادی بیاہ اور دیگر تقاریب میں وہ سب کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔

بعض لوگوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔ غم دوراں اور غم جاناں کو سینے سے لگائے صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اپنے ملنے والوں سے کبھی ان مشکلات کا ذکر تک نہیں کرتے جس میں وہ زندگی بھر گھرے ہوتے ہیں۔ دو وقت کی روٹی کا بندوبست نہ ہو تو وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ پریشان کن بیماریوں کو وہ آزمائش کہہ کر جھیل لیتے ہیں۔ اس کے برخلاف دنیا میں کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی موجود ہیں جو کسی حال میں خوش رہنا نہیں چاہتے۔ دنیا کی ساری نعمتیں لا کر ان کے قدموں میں ڈال دیں، ۵ روپے کے پرامیسری نوٹ پر لکھ دیں کہ آپ کی جھوٹ موٹ کی ساری بیماریاں ہم لینے تیار ہیں، اپنی عمر کے باقی سال آپ کے ۷۵ سالوں میں جمع کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ خوش نہیں ہوں گے۔

یہ سچ ہے کہ خوش رہنا بھی ایک فن ہے۔ اس فن میں مہارت حاصل کرنا بہت آسان ہے بشرطیکہ انسان سنجیدگی سے طے کر لے کہ وہ خوش رہے گا جو لوگ ہمیشہ اپنے اوپر غمزدگی اور مصیبت زدگی کی کیفیت طاری کئے ہوتے ہیں، ان کے لئے میں چند کارآمد اور زود اثر نسخے پیش کر رہی ہوں وہ اسی وقت نوٹ کر لیں، بقیہ زندگی کام آئیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ پہلی فرصت میں وہ اپنے چہرے سے افسردگی اور غمزدگی کا جھوٹا نقاب نکال پھینکیں گے جو انھوں نے جان بوجھ کر چڑھا رکھا ہے۔ سب سے پہلے بیماری کو لیجئے برائے نام بلڈ پریشر میں مبتلا رہنے والوں کو چاہیئے کہ ان مریضوں کو دیکھیں جو کینسر، دق، گٹھیا، فالج، دمہ جیسے تکلیف دہ امراض میں مبتلا ہیں۔ یہ سوچ کر خوش رہیں اور اللہ کا شکر

ادا کریں کہ وہ نوجوانوں سے زیادہ چاق و چوبند ہیں، کھانا اچھا خاصا ہضم ہو جاتا ہے۔ بینائی اور ٹی وی میں گہری دوستی ہے اور اب کیا چاہیئے؟ روتی صورت بنائے، ناخوش رہنے والوں کے لئے میرا ایک نیک مشورہ ہے کہ وہ ہمیشہ کمتر اور چھوٹی چیزوں پر نظر رکھیں کسی کو اگر شکایت ہے کہ گھر چھوٹا ہے، گنجائش کم ہے، چلتے پھرتے دیواروں سے ٹکریں لگتی ہیں تو ناخوش اور شاکی رہنے کی بجائے ان ہزاروں افراد کو دیکھیں جن کے لئے "گھر" نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بے شمار لوگ ایسی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جو دھوپ اور بارش سے بھی نہیں بچا سکتیں۔ کسی کو اگر شکایت ہے کہ ہاتھ میں روپیہ کم ہے تو وہ ایسے خاندان سے اپنا مقابلہ کر کے خوش رہے جس کے پاس مستقل آمدنی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ ہو۔

خوش نہ رہنے کے مواقع مردوں کے مقابلوں میں عورتوں کو زیادہ نصیب ہوتے ہیں۔ مرد زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہو جائے تو وہ کافی، چائے یا کچھ اور پی کر توقع سے زیادہ خوش و خرم گھر لوٹتے ہیں۔ اس کے برخلاف بعض عورتیں تو ناخوش رہنے کے گویا بہانے ہی ڈھونڈتی ہیں۔ مثال کے طور پر بیٹا اپنی بیوی یعنی ان کی بہو کو لے کر پیچھر چلا جائے تو ان کی خوشیاں ختم۔ بہو تین سال لگاتار تین لڑکیوں کو جنم دے تو وہ بہو سے ناخوش۔ ایسے نازک موقع پر ناخوش ہونے والوں سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ لڑکی کی پیدائش پر منہ پھلائے بیٹھی ہیں تو خود لڑکا بن کر کیوں نہ پیدا ہوئیں۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خوش تو رہتے ہیں لیکن ان کے خوش رہنے کی وجہ بڑی نرالی ہوتی ہے۔ یعنی یہ لوگ حسد کی آگ میں جل کر کسی کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔ شاہ جہاں کے دور کا واقعہ لیجئے۔ شیخ سرمد کی گرفتاری کے وقت بہت سے لوگ ایسے تھے جو رو رہے تھے لیکن بہت سے ایسے تھے جنہیں خوشی ہو رہی تھی۔ شیخ سرمد نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ ان کے خیالات کو سمجھتے بھی نہ ہوں گے پھر بھی انہیں خوشی تھی کہ

شیخ سرمد گرفتار کر لئے گئے اور شہید کر دیئے جائیں گے۔ اسی طرح ہر دور میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جنھیں یہ فکر لگی رہتی ہے کہ کوئی مخالف ملے اور اس کو تکلیف پہنچا کر خوش ہو سکیں۔ مخالف نہ بھی ملے تو مخالفت کے اسباب وہ خود بنا لیتے ہیں۔ کسی افسر کو اس کے ماتحت کام کرنے والے کی طرف سے جھوٹ موٹ کی باتیں بنا کر بدظن کروا دیتے ہیں۔ کسی کی شکایت کر کے اس کی ملازمت میں خلل ڈالتے ہیں اور بے حد مسرور ہوتے ہیں۔ مبالغہ اور غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کسی کو بدنام کر کے سمجھتے ہیں کہ دنیا کی ساری خوشیاں اُن کی جھولی میں آگئیں۔ ایسے خوش رہنے والوں کو دور سے سلام۔ ہمیں تو ایسے لوگوں سے کام ہے جو خود بھی خوش رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش دیکھ سکتے ہیں۔

ہم پشیماں نہ ہوئے جھوٹ بول کر

جھوٹ بولنا بھی ایک آرٹ ہے ۔ بہت کم لوگ اس فن میں کامل مہارت رکھتے ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ جھوٹ بولتی ہیں ۔ ایک صاحبہ نے جھوٹ بولنے کی وجہ یہ بتائی کہ انہیں بچپن ہی سے یہ تربیت ملتی رہی کہ جھوٹ کہو جھوٹ کے سوا اور کچھ نہ کہو ۔ مثلاً ان کے بچپن میں ایک دفعہ ان کی والدہ سینما دیکھنے نکل گئیں ۔ اور تاکید کر گئیں کہ ان کے جانے کے بعد کوئی گھر آئے تو سنیما کا ذکر ہرگز نہیں کرنا بلکہ یہ کہنا کہ والدہ دواخانے گئی ہیں ۔ اتفاق سے کوئی رشتہ دار آگئے انہوں نے ابتداء میں تو کہدیا کہ والدہ بیمار ہیں ۔ دواخانے گئی ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے مہمان نے کچھ ایسے انداز سے سوال کیا کہ انہیں جھکنا پڑا اور سچ بات کہدی ۔ اس ایک جھوٹ کے لیے بیچاری کو دو طرفہ ڈانٹ سننی پڑی ۔ ایک طرف سے تو جھوٹ کہنے پر اور دوسری طرف سے جھوٹ کو قائم نہ رکھنے پر ۔

ایک صاحب جو قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے زندگی بھر کسی اسکول کی صورت نہیں دیکھی اپنے آپ کو نان میٹرک بزنس مین کہتے ہیں ۔ جھوٹ کہنا شیخی بگھارنا اور ڈینگ مارنا ان کا محبوب مشغلہ ہے ۔ محلے کے لوگ انہیں جھوٹا میاں اور جھوٹوں کا بادشاہ کہہ کر بلاتے ہیں ۔ حیدرآباد کا نوابی دور ختم ہو گیا لیکن نوابی ذہن رکھنے والے اب بھی باقی ہیں ۔ یہ صاحب اسی قسم کا ذہن رکھتے ہیں ۔ حیدرآباد میں چاہے پیکر میاں اٹھا کر رکھنا شان کے خلاف سمجھتے

تھے۔ باہر جاکر دوسروں کی جھوٹی پیالیاں دھورہے ہیں۔ کچھ دن قبل اپنی ایک تصویر کھچوائی جسمیں بہت ہی قیمتی موٹر کار میں شان سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پھر ایک دن ایسا آیا جھوٹ پر سے پردہ اٹھا۔ وہ موٹر میں تو ضرور بیٹھتے تھے لیکن پچھلی سیٹ پر کار کا مالک بھی بیٹھتا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ کسی نے ایک شخص سے سوال کیا " کیا تم سگریٹ پیتے ہو" اس نے جواب دیا " جی نہیں " " شراب کے عادی ہو " جی نہیں "۔ جوا کھیلتے ہوئے۔ جی بالکل نہیں "۔ تب تو تم میں کوئی برائی نہیں۔

۔ اس شخص نے کہا صرف ایک برائی ہے' میں جھوٹ بہت بولتا ہوں۔

بقول ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور " معصوم قسم کی شیخی اور لن ترانی کے ساتھ جب کوئی آپ بیتی سناتا ہے تو اسے پوا مارنا کہتے ہیں۔ بے معنی باتیں جو مبالغے سے بھری ہوں بھنڈی کہلاتی ہیں۔ بھنڈی روزمرہ کی زندگی میں ایک ضروری فن ہے۔ کنوارا ہر عورت کے ساتھ' عاشق اپنی محبوبہ کے سامنے' شوہر اپنی بیوی سے عادتاً بھنڈی کا سہارا لیتا ہے۔

آدمی اپنی حیثیت اور ماضی کے مطابق جھوٹ بولتا ہے۔ چھوٹے ہو سے دکاندار سے لیکر بڑے سے بڑا کاروباری آدمی حسب موقع جھوٹ بولنے سے گریز نہیں کرتا اسطرح وہ اپنی جائز آمدنی میں اضافہ کرتا ہے۔ مٹھائی فروش عموماً تازہ مٹھائی کے ساتھ باسی رکھدینا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ بعض وقت کسی مخصوص مٹھائی کے بارے میں ان سے استفسار کیا جائے تو وہ اس قدر اطمینان اور یقین کے ساتھ جھوٹ کہہ دیتے ہیں کہ ان کے جھوٹ کو سچ مان کر بہت زیادہ شریف لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔ ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ مٹھائی باسی ہو تو پورے اعتماد کے ساتھ ایک ٹکڑا طشتری میں رکھ کر آگے بڑھاتے ہیں کہ چکھ کر دیکھ لیجیے۔ اس طرح وہ جھوٹ بول کر نہ پشیمان ہوتے ہیں نہ پریشان۔ اس جال میں صرف وہی لوگ پھنسنے میں ہوتے ہیں جو ہچکچاہٹ اور شرم محسوس کرتے ہیں۔ ورنہ عموماً ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ

خوش پوشاک لوگ دکان پر جاتے ہیں۔ اپنی پسندیدہ دو چار قسم کی مٹھائیوں کے تازہ یا باسی ہونے کے تعلق سے پوچھ لیتے ہیں۔ دکاندار یہ سمجھ کر کہ [illegible] گاہک ہے۔ سو گرام میٹھا چکھا دیتا ہے۔ میاں بیوی دونوں دکان پر جائیں تو دو سو گرام چٹ کر کے نفاست سے دستی سے منہ صاف کر لیتے ہیں۔ اور بچوں کے لیے پاؤ کیلو جلیبی یا لڈو خرید کر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے مناظر بڑے دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں ہم اکثر مٹھائی کی دکانوں پر محض ان ہی دلکش نظاروں کی دید کیلئے جاتے ہیں۔

ایک بیکری سے ہم نے کچھ پفس خریدے۔ کاؤنٹر پر کھڑے بچے سے پوچھا "تازہ ہیں نا"؟ اس نے ڈھٹائی سے کہا جی ہاں! بالکل تازہ ہیں یقین نہ آئے تو چکھ کر دیکھ لیجئے۔ پیک کرتے وقت ہم نے پھر زور ڈال کر پوچھا دیکھو۔ تازے ہی ہیں نا؟ اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں رکتے ہوئے کہا۔ جی ہاں تازہ ہیں صبح کے بنے ہوئے ہیں۔ پیسے دیتے ہوئے ہم نے تیسری مرتبہ پھر پوچھا۔ باسی تو نہیں؟ ورنہ ہم واپس لائیں گے دکاندار نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ مریل آواز میں بولا "کل کے بنے ہوئے ہیں" اب آپ ہی بتایئے کہ ہم دکاندار کو جھوٹ سے روکنے اور سچ اگلوانے کے لیے کس کے پاس اتنا وقت کہاں سے آئے گا۔ لیکن یہی بہت سے دکاندار ایک دفعہ جھوٹ بول دینے کے بعد اسکو برقرار رکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔ زیادہ سوالات کئے جائیں تو کھرا جواب دے دیتے ہیں۔ "جہاں اچھا ملتا ہو وہیں چلی جائیے"

بچوں کا جھوٹ ان ہی کی طرح معصوم ہوتا ہے۔ بعض بچے کسی بد مزاج ٹیچر کی ڈانٹ یا مار کے ڈر سے اسکول کے نام سے بھاگتے ہیں۔ ایسے بچے اسکول کا وقت ہوتے ہی پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے نقلی آنسو بہانے لگتے ہیں۔ ممتا جاگ اٹھتی ہے۔ ٹیچر کو کوسنے دیتے ہوئے وہ بچے کو چمٹا لیتی ہے۔ ایسے ہزار اسکول تم پر سے قربان۔ جان ہے تو جہان ہے"۔

جوں ہی بچے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اسے اسکول نہیں بھیج سکتی۔ اس کے پیٹ کا درد غائب ہو جاتا ہے۔ اور وہ کتابیں پٹک کر کھیلنے نکل جاتا ہے۔ چھوٹے

معصوم جھوٹ معافی اور رحم کے قابل ہے

جھوٹ بولنا بظاہر بہت آسان ہے لیکن اس کو نباہنا انتہائی مشکل ہے۔ زیادہ جھوٹ وہی لوگ بولتے ہیں جنھیں سچ بولنا سکھایا نہیں جاتا۔ کچھ عرصہ قبل ہماری ایک موٹی تازی رشتہ دار ملنے کیلئے گھر آئیں قریبی بس اسٹاپ پر اترنے کے بجائے وہ بہت دور اتر کر ہانپتی کانپتی پیدل چلی آرہی تھیں۔ ان کی پیدا یاترا کی اطلاع مل چکی تھی۔ جب وہ ذرا دم سے چکیں تو ہم نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے مختلف قسم کے الٹے سیدھے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ جب ان سے بہت دور سے پیدل چل کر آنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا "پیدل چلنے کو طبیعت چاہ رہی تھی اس لیے ایک اسٹاپ پہلے اتر گئی" سچ کہتے ہوئے ان کا دم خشک ہوتا تھا اسی لیے وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ غلطی سے وہ اتر گئیں۔

ایک صاحبہ ہیں جو ریکارڈ توڑ جھوٹ بولتی ہیں۔ سنا کہ جب وہ گھر میں ہوتی ہیں تو نقاہت اور ناقابل برداشت چکر کا چرچا کر کے دیواریں تھام تھام کر چلتی ہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ باہر نکلتی ہیں تو یہ بھول جاتی ہیں کہ سڑک کے دونوں جانب کوئی دیوار نہیں۔ بغیر کسی سہارے تیز تیز قدم ڈال کر جب وہ دو چار گھر جھانک آتی ہیں تو ان کا پول کھل جاتا ہے۔

جو خواتین مسلسل بیماری کا ڈھونگ رچاتی ہیں انہیں کبھی کبھی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی طرح جب سنجیدگی سے بیمار پڑتی ہیں تو لوگ مسلسل جھوٹ سنتے سنتے اس سچائی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ واقعی بیہوش ہو جائیں تو متعلقین یہ کہہ کر انجان ہو جاتے ہیں کہ بے ہوشی کا ڈرامہ تو ان کی زندگی کا ساتھی ہے۔ ایسی خواتین کو ہمارا مشورہ ہے کہ زمانے کے حالات کی تبدیلی کے ساتھ خود کو بھی بدل دیں کیونکہ اب نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ ناز اٹھانے والے۔

ضعیف ترین خواتین سفید ترین جھوٹ بولتی ہیں۔ عمر کی پختگی کے ساتھ ان کے جھوٹ کا انداز بھی اتنا جاندار ہو جاتا ہے کہ لوگ سچ مان کر بیوقوف بن جاتے ہیں۔ لیکن ایسی

خواتین کو زندگی میں ایک بار عقلمندوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ ان کے جھوٹ کو بڑھاوا دینے کی کسی قیمت پر تیار نہیں ہوتے۔ مثلاً پیٹ میں شدید درد ہے تو کھانا ڈٹ کر کیسے کھائیں۔ جان لیوا چکر ہیں تو لگاتار ٹی وی کیسے دیکھ رہی ہیں۔ انتہائی نقاہت ہے تو گھر گھر کی جھاڑ دینی کیسے پھرتی ہیں ہر گھر میں ایسے ہمت والے پیدا ہو جائیں تو سفید جھوٹ کا خاتمہ یقینی ہے۔

قصہ مختصر جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود جھوٹ کے پتلے جھوٹ سچ لگا کر جھوٹ کے دفتر اور جھوٹ کے پل باندھنے سے کبھی نہیں تھکتے۔ اب تو یہ حال ہے کہ چھوٹے بچوں کی شدید بیماری میں بھی والدین ان کی دوا اور غذا کا انتظام کر کے ملازمت کے لیے چلے جاتے ہیں۔ وہ دور بھی نہیں رہا کہ گھر میں ایک چھوڑ تین تین آدمی ہمیشہ خدمت کے لیئے تیار رہتے ایک اوپری کام والی، ایک پکانے والی، اور ایک مغلانی۔ آج کے زمانے میں ایک عورت اوپری کام والی بھی ہے، پکانے والی بھی ہے، مغلانی بھی اور ماں اور بیوی بھی لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ گھر کی مالکن ہے۔

ایسے مشینی دور میں اگر ضعیف خواتین جھوٹ کا سہارا لیکر دوسروں کو مستقل پریشان کرنا چاہیں تو یہ ان کی نادانی ہے۔ ملادت کے تیل اور ایک چمچہ آٹے کے حریرے سے اگر نقاہت کم ہو جاتی تو طاقت کی دوائیں جوں کی توں کانوں میں دھری رہ جاتیں۔ عطر کے اگر ایک پھائے سے اگر بیہوشی چلی جاتی تو پھر ڈاکٹر دواخانوں میں مکھیاں مارتے ہوتے۔ بہرحال زمانہ بدل گیا ہے۔ بیہوشی کی جھوٹی ایکٹنگ کرنے والوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سچ مچ بیہوش ہو جائیں اور متعلقین ہمیشہ کی طرح جھوٹ سمجھ کر سنیما دیکھنے چلے جائیں۔

" بیتے کی بات کہدوں " سچ مچ بیہوش ہونے کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔" ۔۔۔

حیدرآباد کی شادیاں

شادی کے لئے لڑکے اور لڑکی کے علاوہ قاضی اور دو گواہ کافی ہیں۔ حیدرآباد کی شادیوں کے بھی یہی لوازمات ہیں۔ دو دلوں کے اس میل کیلئے خاندان کے افراد دوست احباب پیشہ ورمشاطہ کے علاوہ اخبار بھی مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ آجکل حیدرآباد میں لفظ "شادی" کا مفہوم کچھ بدل سا گیا ہے۔ بیشتر شادیاں خالص کاروباری انداز میں انجام پارہی ہیں۔ اشتہار بازی کے لیئے اخباروں کے کالم مختص ہیں۔ اشتہار بازی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے "ایک معزز خاندان کی ۲۲ سالہ خوبصورت، نیک سیرت صوم وصلوٰۃ کی پابند لڑکی کے لیئے ڈاکٹر یا انجینئر سے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی کے دو بھائی گرین کارڈ ہولڈر ہیں۔ بیروزگار لڑکے کو اندرون ایک ماہ باہر نوکری دلانے کا پورا ذمہ لیا جاتا ہے۔

اس قسم کے اشتہار دے کر لڑکی والے ایکطرح سے لڑکے کو مکمل طور پر خرید لیتے ہیں۔ یعنی جوڑے گھوڑے کے نام پر کثیر رقم اور ملازمت دلانے کی ترغیب دے کر لڑکی کے دو بھائی اگر گرین کارڈ ہولڈر ہیں تو خدا سے دعا ہے کہ تیسرا بھائی بھی جلد از جلد کسی اور رنگ کا کارڈ حاصل کرے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اب آپ اس لڑکے کی غیرت کی داد دیجئیے جو لڑکی سے بے حساب روپیہ پیسہ ہر قسم کا سامان لے کر اسی کے پیسے سے اور اسی کا احسان اٹھا کر ملازمت کے لیئے جاتا ہے۔ کاش ایسے انسانوں میں سوچنے اور غور کرنے کا کچھ تو

جذبہ ہوتا۔

حیدرآباد میں اکثر لڑکی والے جوڑے کی رقم خود اپنی طرف سے مقرر کرکے لڑکے والوں کے دماغ خراب کر رہے ہیں۔ متوسط گھرانے کی ایک صاحبہ نے حماقت میں آکر اپنی لڑکی کی شادی پر ایک لاکھ روپے خرچ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس ایک لاکھ کے بجٹ میں انہوں نے اپنے جہیز میں ملے ہوئے چالیس سال پرانے سماور، کنگال اور تانبے کے پرانے برتنوں اور زیور کو نئی قیمت لگا کر رکھا تھا۔ لڑکے کی ماں بہت ہی ہوشیار، موقع پرست اور لالچی تھی۔ اس نے عین وقت پر قیمتی سامان کی فہرست مشاطہ کے ذریعہ لڑکے کے گھر بھیج دی کہ اس ایک لاکھ میں سے آپ جوڑے کے پچیس ہزار نکال کر بقیہ رقم میں فریج، ٹی وی، گیزر، واشنگ مشین، ٹیپ ڈیک، آلوین فرنیچر اور الماس کا زیور لے لیں۔ لڑکی والے پریشان ہو گئے لیکن عزت کا معاملہ تھا۔ نہ رشتہ توڑا جا سکتا تھا اور نہ بغیر مانگ پوری کئے رشتہ جوڑا جا سکتا تھا۔ رحم کی بھیک مانگ کر لڑکے کو کچھ کم رقم میں اگر خرید لیا جائے تو لڑکی طعنوں کا شکار ہو کر زندہ رہنے پر مجبور ہوتی ہے یا دوسری صورت میں ایسے جینے سے موت کو گلے لگانا ہی بہتر سمجھتی ہے۔

شادیوں میں مہمانوں کی ضیافت مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ سردی کا موسم ہو تو چائے گرمی کا موسم ہو تو آئس کریم۔ چائے سے بہت لگاؤ رکھنے والے میزبان شاید گرمی میں چائے ہی سے ضیافت کرنا پسند کرتے ہیں۔ گزشتہ چند دنوں قبل ہم نے سردی کے موسم والی ایک شادی میں شرکت کی۔ میزبان کو ہم ڈھونڈ نکالنا ہی چاہتے تھے کہ ایک ویٹر نے بغیر طشتری والی چائے کی پیالی ہاتھ میں تھما دی ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ گنجائش کے لحاظ سے کشتی میں صرف پیالیاں رکھی گئی ہیں۔ دوسرا ویٹر طشتری لے کر دے گا۔ اتنے میں ایک ضدی بچے نے دھکا مارا تو چائے چھلک کر گرنے لگی۔ ابھی ہم کپڑوں پر گرتی ہوئی چائے کو سنبھالنے نہ پائے تھے کہ

دو منٹ بعد دیگر نے ایک ورقی سموسہ دوسرے ہاتھ میں تھما دیا۔ آجکل شادی کی دعوتوں میں ورقی سموسے بنانے والے باورچیوں میں ایک مقابلہ سا چل رہا ہے کہ کون باریک سے باریک پرت والے سموسے تیار کر سکتا ہے اور کس کے بنائے ہوئے سموسوں سے مہمانوں کے کپڑے زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں۔

شادی کے رقعے میں ایک چھوٹا سا کارڈ لگا ہوتا ہے جس پر "چوتھی ولیمہ ڈنر" لکھا ہوتا ہے گذشتہ چند سال قبل یہ ڈنر الگ الگ ہوتے تھے۔ دوستی اور رشتے کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کارڈ رقعے کے ساتھ بھیجے جاتے۔ کسی کو دو کارڈ، کسی کو ایک اور کسی کو ایک بھی نہیں۔ بہر حال آجکل یہ دو ڈنر ایک ہو گئے ہیں۔ دیگ کے پاس عموماً دلہن کے باپ کا قریبی دوست بیٹھتا ہے جسے پکوان سے فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ ڈنر پر خرچ ہونے والی رقم دونوں سمدھی مساوی طور پر خرچ کرتے ہیں۔ لیکن بچی ہوئی بریانی، مرچ کا سالن اور ڈبل کا میٹھا منتظمین اپنے گھر لے کر چلے جاتے ہیں۔

گلِ فردوس اس لئے نہیں بچتا کہ یہ بچوں بڑوں سبھی کا مرغوب میٹھا ہے۔ اور لوٹ کر کنگال پن سے کھایا جاتا ہے باسی بریانی گھر والوں کے علاوہ دو چار دن رہنے والے رشتہ داروں اور پاس پڑوس میں رہنے والے لوگوں کے ناشتے میں کام آتی ہے۔ ایک ہی دن میں اس باسی بریانی کی وجہ سے دونوں خاندانوں میں رنجش پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن جب اطلاع ملتی ہے کہ بغیر قلعی والے دیگوں کی کرامت سے سارے لوگ متاثر ہو گئے تو دولہا والے اطمینان کی سانس لیتے ہیں۔

بعض شادیوں کے دعوت نامے بڑے دلچسپ مگر مصلحت آمیز ہوتے ہیں۔ رقعے کے ساتھ "چوتھی ولیمہ ڈنر" کا کارڈ بھیج دیا جاتا ہے لیکن دو بچوں کے عقیقے کی دعوت زبانی دی جاتی ہے عقیقے کے بکروں کی بریانی بنی ہے۔ کہنے کو تو شادی کی دعوت دی جاتی ہے لیکن ہوشیار میزبان ایک ڈنر دے کر تین تین تحفے وصول کرتے ہیں۔

"چوتھی ولیمہ ڈنر" کا کارڈ دور کے رشتہ داروں کو نہیں دیا جاتا۔ شکایت کرنا حماقت ہے۔ یہ دعوت دینے والے کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن ستم ظریف بعد میں ڈنر میں نہ آنے کی وجہ پوچھ بیٹھتے ہیں۔ جب انہیں سنجیدگی سے بتلایا جاتا ہے کہ ایسا کوئی کارڈ بھی نہیں گیا تھا تو وہ اپنا بناوٹی انداز سے اپنے بچاؤ کے لیے کہہ دیتے ہیں یقیناً ہم نے کارڈ بھیجا تھا گرگیا ہوگا غور طلب بات ہے کہ قریبی رشتہ داروں کے حصے کے کارڈ تو پنچ کئے ہوئے دیکھنے کو ملتے ہیں اور دور کے رشتہ داروں کے لیئے پنچ بھی ایسا استعمال ہوتا ہے کہ بیچارے شادی کا رقعہ لانے والے کو کارڈ کے گرنے کی خبر تک نہیں ہوتی ہے۔ ایسی دعوت دینے والوں کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ بعد میں اس قسم کے سوالات کر کے تعلقات کو خراب ہونے نہ دیں مصروفیت اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے اس دور میں شادی کی ایک دن کی دعوت میں شریک ہونا بھی بڑی بات ہے۔

حیدرآباد میں بڑے گھرانوں کی شادیاں بہت ہی شاندار پیمانے پر انجام پا رہی ہے ہزاروں روپیہ خرچ کیا جارہا ہے۔ بڑے سے بڑے شادی خانے سجائے جا رہے ہیں۔ اس بڑھتے معیار کے ساتھ میزبانوں کی اخلاقی قدریں گرتی جا رہی ہیں۔ اکثر شادیوں میں دولہا کی طرف سے دعوت دینے والی خواتین یعنی اس کی ماں اور بہن وغیرہ وقت مقررہ پر نہیں آتیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مہمان جب شادی خانے میں قدم رکھتے ہیں تو اجنبی چہروں سے ہی سابقہ پڑتا ہے۔ دلہن کی طرف کے فوٹو گرافر بجائے بغیر ریل کا کیمرہ گلے میں ڈالے صرف فلیش مارتے پھرتے ہیں۔ بے جا لاڈ میں پلے ہوئے بچے سجے سجائے منڈپ کے پھول توڑنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ دلہن کی سہیلیاں اپنے میک اپ کو درست کرنے میں مگن رہتی ہیں۔ قریبی سہیلی کو اپنے بھاؤ بتانے کا بہترین موقع ملتا ہے۔ ایسے میزبانوں کے لیئے ایک مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ مہمانوں کو دیئے گئے وقت سے قبل شادی خانے میں موجود رہیں۔ وقت کی پابندی کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خواتین دو بجے سے تیاری شروع کردیں کسی کے رحم و کرم پر لی ہوئی ایک سست رفتار موٹر کے دو چکر کے

سکے تک کرایہ کی ایک گاڑی کا انتظام کریں۔ اور شادی خانے میں آنے کے بعد ضیافت کے موقع پر سب مہمانوں کا یکساں خیال رکھیں۔ ورنہ اکثر شادیوں میں یہ ہوتا ہے کہ ایک مہمان دو قسم کی آئسکریم کا دو مرتبہ ذائقہ چکھتا ہے اور بازو بیٹھنے والا منہ میں پانی لاتے ہوئے میزبان کو دل ہی دل میں گالیاں دیتا ہے۔

آرسی مصحف، دھنگانے کی رسم، جوتا چھپانے کی رسم کے علاوہ اور دوسری بہت سی دلچسپ اور مقبول رسومات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک دفعہ باہر سے آئے ہوئے ایک خاندان نے یہاں کی رسومات دیکھنے کی خاطر ہمارے ساتھ ایک شادی میں شرکت کی۔ دولہا کا منڈپ سجا ہوا تھا۔ زنانے اور مردانے میں چہل پہل کچھ زیادہ بڑھتی نظر آئی۔ نکاح کا وقت آ پہنچا۔ دولہا شان سے سہرے میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ کچھ لوگ آگے بڑھے انہوں نے اس کا سہرا کھینچنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فرش پر پھول بکھر گئے۔ ہمارے ساتھ آنے والا مہمان اس رسم سے بہت محظوظ ہوئے انہوں نے کہا یہاں کی یہ رسم بڑی دلچسپ ہے اسے کونسی رسم کہتے ہیں۔؟ ہم نے کہا یہ سہرے کی لڑیاں توڑنے کی رسم ہے۔ اور صرف ان شادیوں میں ہوتی ہے جہاں دولہا، بیوی اور باشعور بچوں کی موجودگی میں عیاشی کی خاطر دوسری شادی رچاتا ہے۔

آجکل حیدرآباد میں جو شادیاں ہو رہی ہیں ان سے متعلق ایک خوش آئندبات جو محسوس کی جارہی ہے وہ یہ کہ بعض گھرانے ایسے ابھر رہے ہیں جو جوڑے گھوڑے کے نام پر ایک پیسہ بھی لینا نہیں چاہتے وہ صرف سیرت اور خاندانی لڑکی چاہتے ہیں۔ اس مبارک دن کا شدت سے انتظار ہے جب ایسے شریف گھرانے عام ہو جائیں گے۔ جوڑے کی رقم اور جہیز کی فہرست مانگنے کی فرسودہ لعنت ختم ہو جائے گی۔ یہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ نوجوان نسل خصوصاً طلباء اس بات کا عہد کریں کہ نہ وہ جوڑے کے نام پر رقم لیں گے اور نہ جہیز کا مطالبہ کریں گے۔ شادیاں تو جب بھی ہوں گی فرق اتنا ضرور ہوگا کہ ان لڑکیوں کی بھی ہو سکیں گی جو محض روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ماں باپ کے گھر بیٹھی رہنے پر مجبور ہیں۔

ریل - ریلوے اسٹیشن

گذشتہ زمانے میں ہوائی جہاز سے سفر کرنا قابلِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ آجکل ریلوے اسٹیشن اور ایرپورٹ میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ جانے والے کو پھول پہنا کر چیختے پیٹتے ریلوے پلیٹ فارم پر ڈالے جاتے ہیں اس سے زیادہ ایرپورٹ پر بھی بکھیرے جاتے ہیں۔ تہذیب و شائستگی اور صفائی کا مظاہرہ دونوں جگہ برابر ہوتا ہے۔ باہر جانے کے چکر کی وجہ سے ریلوے اسٹیشنوں پہ ہجوم دن بدن بڑھتا ہی جارہا ہے۔ ایک مسافر کو چھوڑنے کے لیے بے شمار لوگ ریلوے اسٹیشن پر موجود رہتے ہیں۔ اکثر لوگ بڑے راستے سے اندر جاتے ہیں۔ ٹکٹ چکر پر کام کا بار کم کرنے کے لیے، وہ واپسی میں چھوٹے محفوظ راستوں کو ترجیح دیتے ہیں دخصت کرنے کے لیے آئے ہوئے چند لوگ ریل کے ڈبے میں جاکر سامان اور سیٹ کی حفاظت کرتے ہیں۔ مسافر ریلوے اسٹیشن پر اپنے قریبی دوستوں یا منگیتر سے باتیں کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ گارڈ نے سیٹی دیدی اور پھولوں کے ہار پہنا ہوا پلیٹ فارم پر ہی رہ گیا۔ آپ نے وہ لطیفہ سنا ہوگا کہ ریل چلنے لگی تو اندر بیٹھے ہوئے مسافروں نے بڑی مشکل سے ایک وزنی آدمی کو پکڑ کر ڈبے میں لالیا۔

ریل کی رفتار تیز ہوگئی تو ان لوگوں نے بہادری سے کہا ذرا دیر ہوتی تو آپ پلیٹ فارم پر ہی رہ گئے ہوتے۔ اس آدمی نے شرمندہ ہوکر کہا "دراصل مجھے جانا نہیں تھا میں اپنے

دوست کو چھوڑنے آیا تھا۔

اکثر ریل گاڑیاں لیٹ ہوتی ہیں۔ اس کے نقصانات کم ہیں البتہ مختلف قسم کے لوگوں کے لئے مختلف قسم کے فائدے بہت ہیں۔ ایک فائدہ ان سرپرستوں کے لئے ہے جن کی بارہ تیرہ سال والی لڑکیاں ذرا سے قدم بہکنے سے گروپ کی شکل میں بمبئی بھاگنے کا ارادہ کرکے ٹرین میں بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ ٹرین لیٹ ہوتی ہے اس لئے منزل مقصود پہنچنے سے قبل ہی گھروں کو واپس لائی جاتی ہیں۔ دوسرا فائدہ آٹو والوں کے لئے ہے۔ ایک دفعہ محبوب نگر سے حیدرآباد آنے والی ریل نے اپنی مہربانی سے ہم لوگوں کو رات کے ایک بجے سکندرآباد ریلوے اسٹیشن پر لاکر چھوڑ دیا۔ آٹو والوں کے لئے روپیہ بنانے کا یہ زرین موقع ہوتا ہے۔ ایک ہمدرد آٹو والے نے چلنے کی حامی بھر دی آدھا راستہ چلنے کے بعد وہ غلط راستے پر جانے لگا۔ لیکن جلد ہی اس کا دماغ درست کردیا گیا تو وہ سنجیدگی سے کہنے لگا "میں شارٹ کٹ جارہا تھا۔"

اکثر ریل گاڑیوں میں چوبیس گھنٹے کے سفر میں مسافر ایک دوسرے کے گہرے دوست بن جاتے ہیں۔

بعض ہمدردی میں ایسے لوگوں کے لئے بار بار ریل سے اتر کر پانی بھی لاتے ہیں جو بیوی بچوں کو ریل میں چھوڑ کر نیچے اترنا نہیں چاہتے۔ یہ ہمدردی رات ہونے تک اعلیٰ بڑھ جاتی ہے۔ شوہر نیند سے جھوکے کھاتا رہتا ہے ایسی صورت میں ریل کا ہمدرد ساتھی کہتا ہے "آپ بے فکری سے سو جائیے مجھے جاگنے کی عادت ہے"۔ بے فکری سے سوکر جب وہ اٹھتا ہے تو ریل کا ساتھی اس کے سوٹ کیس سمیت غائب رہتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر متعین قلی بھی مسافرین سے بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ کراچی جانے کے سلسلہ میں جب ہم لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو بیک وقت کئی قلی سامان پر جھپٹنے۔ ہمارے سامان کی قسمت کا فیصلہ جس قلی کے ہاتھ تھا اس نے ایک مخصوص کسٹم آفیسر کی میز تک

سامان بحفاظت پہنچا دیا۔ ذرا دم لیکر نرم لہجے میں پوچھا آپ کے پاس سامان کیا کیا ہے ؟ بھاری ساڑیاں کتنی ہیں۔ ؟ ہم نے قلی کو اطمینان دلایا کہ سامان زیادہ نہیں ہے لیکن چہرے کی بے اطمینانی سے وہ بھانپ گیا کہ چھ سات سوٹ کیس یوں ہی نہیں لائے گئے ہیں۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا "چار سو ہوں گے" ۔ میرے سو، بابو جی کے تین سو" ہم نے رعب ڈالنے کے لیے کہا کیا مطلب کاہے کے پیسے ؟ یہ سنتے ہی قلی نے بابوجی کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ایک سوٹ کیس کھول کر سامان کے حصے کرنے شروع کر دئے۔ یہ رنگ دیکھ کر ہم نے قلی سے آہستہ سے کہہ دیا ٹھیک ہے ڈیڑھ سو روپے دے دیں گے۔ قلی نے بابو جی کو سگنل دیا۔ سوٹ کیس بند ہو گیا۔ سامان ریلوے پلیٹ فارم سے باہر پہنچ گیا۔ قلی نے فاتحانہ انداز سے روپے بٹو ئے جیب میں رکھکر چلتا بنا۔ کسٹم آفیسر اور قلی کے دوستانہ تعلقات اور دونوں کے ایک دوسرے پر اعتبار کے جذبے کو دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے۔ ورنہ اس زمانے میں ایک بھائی دوسرے بھائی پر اعتبار نہیں کرتا۔

ریل کے سفر کے دوران مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اگر کوئی عورت مصیبت زدہ بن کر رو کر یہ کہے کہ وہ "تنہا ہے" اس کا کوئی نہیں تو ہرگز یقین نہ کیجئے۔ ایسی عورت آگے چل کر مصیبتوں کے جال میں گھیر سکتی ہے۔ بعض مسافر ریل میں اچانک پریشان کن بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ لاہور والی ریل میں ہمارے ڈبے میں ایک خستہ حال آدمی تھا۔ اس کے ساتھ تین بیٹیاں اور چھ بیٹیاں تھیں۔ ریل جب لاہور اسٹیشن کے قریب پہنچنے لگی تو اس آدمی پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ اس کی لڑکیاں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ ڈبے میں موجود سارے مسافر پریشان ہو گئے۔ سبھوں نے ہمدردی اور پریشانی کا اظہار کیا۔ بچیوں کو روٹی، بسکٹ، میوے، مٹھائی اور تسلی کے ساتھ روپے دئے گئے۔ ریلوے اسٹیشن پر متعین کسٹم آفیسر کو اطلاع ہوئی۔ اس کے سامان کی جھڑتی نہیں لی گئی۔ سب کی ہمدردیاں سمیٹے وہ پلیٹ فارم کے

باہر پہنچا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس خاندان کو ہم نے دیکھا۔ ان کے سوٹ کیس سلیقے سے جمے جمائے ایک طرف رکھے تھے۔ لڑکیاں ہنستی بولتی seven up پی رہی تھیں۔ دل کا مریض سگریٹ کے کش پر کش لے رہا تھا اور مسکرا کر نظروں ہی نظروں میں ہم مسافروں سے پوچھ رہا تھا "کیوں؟ کیسے الو بنایا تم سب کو"۔ اٹاری سے امرتسر جانے والی ایک ٹرین میں ایک آدمی پیٹر کے دانت گرانے والا منجن بیچ رہا تھا۔ اس نے ایک بیگ میں سے پڑیاں نکالیں اور اپنے مخصوص کاروباری لہجے میں منجن کے فائدے گنانے شروع کئے۔ اس ڈبے میں موجود تین چار آدمیوں نے جلدی سے پیسے نکالے اور منجن خرید لیا۔ قریب ہی ایک شریف عورت بیٹھی تھی۔ اس عورت نے ایک چٹکی منجن دانتوں پر لگانے کی کوشش کی ایک سیکنڈ میں منجن بیچنے والے کا ہاتھ عورت کے منہ تک پہنچا۔ پلک جھپکتے میں بغیر خون کا قطرہ ٹپکے دانت اس منجن والے کے ہاتھ میں تھا۔ سارے مسافر حیران رہ گئے۔ کئی لوگوں کی جیبوں سے پیسے نکل کر منجن والے کی جیب میں منتقل ہو گئے۔ ریل میں یہ دھندہ روز ہوتا ہے اس عورت کا دانت روز گرتا ہے۔ ریل وہی ہے، پلیٹ فارم وہی ہے، صرف الو بننے والے مسافر بدلتے رہتے ہیں۔

میرا پہلا مزاحیہ مضمون پڑھنا

مضمون چاہے سنجیدہ ہو یا مزاحیہ ایک باصلاحیت اور محنتی ادیب بآسانی لکھ لیتا ہے۔ وہ اپنی اسی فطری صلاحیت کا صحیح استعمال کرتے ہوئے مسلسل لکھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صاحب تصنیف ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی ادیب کو جب پہلی مرتبہ ریڈیو یا اسٹیج پر آنا ہوتا ہے تو اس پر جو آفتوں کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں اسی کا دل جانتا ہے۔

آج مجھے اپنے پہلے مزاحیہ مضمون پڑھنے کے تاثرات سنانے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس سے قبل اپنی مزاح نگاری کی ابتدا کے بارے میں بتا دوں تو ٹھیک رہے گا۔ بچپن کی بہت سی باتیں، بہت سے دلچسپ واقعات میرے ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ ہیں۔ سوچتی ہوں تو بہت سی باتیں یاد آتی چلی جاتی ہیں۔ شرارت اور مزاح کے ملے جلے جراثیم میری فطرت میں اس وقت سے موجود تھے۔ ہائی اسکول اور کالج میں بھی ہمیشہ میری شرارت شائستگی کے حدود میں رہتی۔ میں نے ہمیشہ اپنے اساتذہ کی عزت کی۔ اور اس کا پھل اب مجھے اپنے شاگردوں سے مل رہا ہے۔ اسکول میں، میں نے دو تین مزاحیہ نظمیں تلگو اور اردو میں بھی لکھی تھیں۔ ہائی اسکول کے زمانۂ طالب علمی میں وقتی موڈ میں کسی مزاحیہ موضوع پر لکھ دیتی اور ماہنامہ بانو میں کبھی اشاعت کے لئے بھیج دیا کرتی۔ کئی سال کے وقفہ کے بعد میں نے سنہ ۹۰ء سے باقاعدہ لکھنا اور مضامین شائع کروانا شروع کیا۔ میں زندہ دلانِ حیدرآباد

کے ادبی جلسوں میں کئی سال سے پابندی سے شریک ہوتی تھی۔ شروع سے آخر تک تمام مزاح نگاروں کو انتہائی دلچسپی سے سنتی تھی۔ اس وقت میرے مضامین شگوفہ میں شائع ہونے لگے تھے۔ مزاح نگاروں کو اسٹیج پر دیکھ کر ان سے مرعوب رہتی تھی۔ کسی سالانہ جلسہ میں ان کے روبرو جاکر سلام کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ ۱۹۷۸ء کی بات ہے ایک دن مصطفیٰ کمال صاحب ایڈیٹر ماہنامہ "شگوفہ" کالج آئے اور اپنے مخصوص شائستہ اور سنجیدہ انداز میں مجھ سے کہا کہ اس سال آپ زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاس میں مضمون سنائیے ایسے لگا جیسے کہیں وہ مجھے بنا تو نہیں رہے ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ مضامین چھپتے ہیں تا بس یہی کافی ہے۔ لیکن انہوں نے اصرار میں اور شدت پیدا کرکے میری زبان سے کہلوا لیا کہ اچھی بات ہے میں مضمون سناؤں گی۔

جلسے کا دن آپہنچا وقت سے آدھا گھنٹہ قبل میں گاندھی بھون پہنچ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ لوگ آنے لگے کچھ دیر بعد کسی کرم فرمانے ایک بیاج میرے ہاتھ میں تھمادیا مجھے ایسا لگا گویا موت کا پروانہ مل گیا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے بیاج تو لگالیا لیکن اس کے بعد اس احساس میں شدت ہوگئی کہ ہر کوئی مجھے دیکھ رہا ہے حالانکہ کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر تمام مضامین سنانے والوں کے ناموں کا اعلان ہوا اور سب کے ساتھ میں بھی اسٹیج پر پہنچ گئی۔ جلسہ شروع ہوا۔ جوں ہی کسی مزاح نگار کا مضمون ختم ہوتا اپنی باری کے خیال سے میرا دل بے تکے پن سے دھڑکنے لگتا۔ موت واقعی سر پر منڈلا رہی تھی۔ اسٹیج کے قریب ہی بوگس حیدرآبادی کھڑے انتظامات میں مصروف تھے۔ انہوں نے پوچھا کیا! مرنے سے پہلے آپ کی آخری خواہش کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے صرف ایک گلاس پانی چاہیئے "بس اور کچھ نہیں" میں اس پانی اور گلاس کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ بمشکل ایک گھونٹ پانی میرے حلق سے اترا ہوگا۔ باقی بھرا گلاس وہ میرے ساتھ تھل میں ناچنا چاہتا تھا۔ جھٹ سے میں نے اسے نیچے رکھ دیا کہ بھلا یہ بھی کوئی

موقع محل ہے ناچنے کودنے کا۔ غور کیا تو پتہ چلا کہ گلاس کا کوئی قصور نہ تھا۔ بیچارے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میرے نام کا اعلان ہوا۔ کسی حال مجھے اپنی کرسی چھوڑنی پڑی۔ مائیک پر آکر میں نے سانس روک کر تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "میرے مضمون کا عنوان ہے "بچہ باہر گیا ہے"۔ قسمت دیکھئے کہ عنوان سنتے ہی سامعین کی طرف سے قہقہوں کی بارش ہونے لگی۔ ادھر میرا دم گھٹ رہا تھا کہ ابھی تو صرف ایک سیکنڈ گزرا ہے۔ باقی نو منٹ انچاس سیکنڈ کیسے گزریں گے۔ مضمون یوں شروع ہوا۔

"اگر آپ کسی کے گھر جائیں اور صدر خاندان کے ہاتھ میں چارمینار سگریٹ کی بجائے ڈن ہل کا قیمتی پیکٹ دیکھیں تو کھٹ سے یقین کر لیجیے کہ اس گھر کا کم از کم ایک بچہ باہر ضرور گیا ہے"۔

ان ابتدائی جملوں سے بھی سامعین محظوظ ہوئے۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں ایکسپریس بس کی طرح بغیر رکے تیزی سے بڑھتی چلی جارہی ہوں۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں میں اپنے ہوش و حواس مکمل طور پر کھو بیٹھی تھی۔ میرے مرشد نے زمانہ طالب علمی میں یہ بات بتائی تھی کہ اگر کوئی ایسا موقع آئے تو مقرر کو اپنے اوپر پورا اعتماد رکھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہیے کہ حاضرین جلسہ میں سب سے زیادہ عقلمند، باصلاحیت اور مشہور ہستی وہی ہے۔ دوسرے سب قابلیت میں اس سے کم ہیں۔ ایک سکنڈ کے لیے دل نے مجھ سے کہا تو ہی سب سے قابل ہستی ہے۔ تیرا وجود دنیائے ادب کے لیے باعث فخر ہے لیکن یہ چال کامیاب نہیں ہوئی۔

ملک بھر کے نامور طنز و مزاح نگار آنکھ دکھلانے لگے کہ گھور گھور کر کے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے ہم پر رعب جمانے آئی ہے۔ ادھر صدر اور مہمان خصوصی کی پر اثر شخصیتیں مجھے مرعوب کر رہی تھیں۔ ہال پر ذرا بھی نظر پڑی تو ایک سے ایک قابل لوگ، کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ سب کچھ ایک طرف، میں اپنا مضمون پڑھتی رہی — پڑھتی رہی — مضمون کا

عنوان جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ "بچہ باہر گیا ہے" تھا۔ اس میں بہت سے واقعات ان ہی گھرانوں سے متعلق تھے جن کے گھر کا کوئی فرد ملک سے باہر ہے ایک موقع پر میں نے سنایا۔

"غائبانہ نماز جنازہ کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا کہ جب کوئی دیار غیر میں مر جاتا ہے تو اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے ہم بھی اس اصطلاح سے واقف ہیں لیکن غائبانہ ختنہ کے پھول یا غائبانہ کھیر چٹائی کا دعوت نامہ دیکھ کر ہم انگشت بہ دنداں رہ گئے۔ ریاض میں نواسے کی ختنہ ہوئی حیدرآباد میں ارمان نکالے گئے۔ نانا پھول پہنے حریرہ روٹی کھاتے ہوئے روپے سمیٹ رہے تھے۔ کویت میں پوترے کی پیدائش ہوئی تھی حیدرآباد میں دھوم سے کھیر چٹائی کی گئی۔ دادا بیٹھے کھیر چاٹ رہے تھے۔"

ان جملوں نے بھی مجھے توقع سے زیادہ قہقہے دیے۔ ادھر قہقہوں کی گونج تھی ادھر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے تھوڑی دیر بعد میری نماز جنازہ میں یہی لوگ شریک ہوں گے۔ مضمون کے درمیانی حصہ میں یہاں ہونے والے چھوٹے موٹے کاجوں پر اہتمام اور فضول خرچی کا ذکر تھا اس عبارت پر ختم ہوا

"باہر کے کرشمے دیکھ کر ہمارے بھی منہ میں پانی آیا۔ ہمارا تیرہ سالہ لڑکا جو اب تک ہمارے ہاتھ سے کھانا کھاتا ہے اس سے مخاطب ہو کر ہم نے کہا۔ "بیٹا تو بھی باہر جائے گا لاکھوں کمائے گا۔ ماں باپ کے لیے بلڈنگ ...... ہماری بات کو کاٹتے ہوئے اس نے بگڑ بیچے میں کہا باہر جانے کا نام لے ماں تو آج سے اسکول جانا بند۔ لائیے نوالہ۔ نوالہ پورا کر کے خدا حافظ کہتا ہوا بچہ باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دروازہ پر کھٹکا ہوا۔ کچھ رشتہ دار سعودی عرب سے ملنے آئے تھے۔ ادھر ادھر دیکھ کر تھوڑی دیر بعد انہوں نے پوچھا آپ کا بچہ کہاں ہے۔ ہم نے

سر اونچا کرکے فخریہ انداز میں کہا۔ بچہ باہر گیا ہے۔ گلی ڈنڈا کھیلنے ۔
آخری جملے پر بہت سے لوگوں نے بے اختیار داد دی۔ جلسے کے اختتام پر اکثر سامعین کی طرف سے مبارکباد بھی ملی۔ اس وقت تک بھی میرا دل کچھ زور ہی سے دھڑک رہا تھا۔ شاید مجھے سنانے میں لطف آرہا تھا۔

اس سخت امتحان سے جوں توں کرکے گزر گئی ۔ ادبی اجلاس کا ٹیپ شدہ پروگرام حیدرآباد کے مزاح نگار سید نصرت نے سعودی عرب سے منگوایا تھا۔ ان کا ایک خط شگوفہ میں شائع ہوا جسمیں انہوں نے جلسے کے تمام مزاحیہ مضامین کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا۔

" ڈاکٹر حبیب ضیا ہماری محفل میں پہلی بار آئی ہیں لیکن خوب آئی ہیں "۔

اس مضمون کے بعد مجھے زندہ دلان حیدرآباد نے ہمت افزائی کےلیے متواتر تین سال مضمون سنانے کا موقع دیا۔ اور مجلس عاملہ کا رکن بھی بنادیا ۔ ۱۹۸۱ء میں میرے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "گویم مشکل" کے نام سے شائع ہوا ۔ اس مجموعہ میں وہ مضمون بھی شامل ہے جس نے میری حرکت قلب کو بند کر دینے کا منصوبہ بلند یا تھا یعنی وہی پہلا مضمون "بچہ باہر گیا ہے" دلچسپ بات تو یہ ہے کہ مختلف اصحاب نے گویم مشکل کے جن مضامین کو پسند کیا ان میں یہ مضمون مشترک ہے

بہرحال ایک بڑے جلسے میں زندگی میں پہلی بار جو مضمون سنایا تھا وہ میری زندگی کا ایک یادگار تجربہ تھا۔ ایک کڑی آزمائش تھی جو زندہ دلان حیدرآباد کی طرف سے لی گئی تھی۔ اس واقعہ کے بارے میں سوچتی ہوں تو کبھی شرمندگی ہوتی ہے۔ اور کبھی اپنی بزدلی اور ڈرپوک پن پر ہنسی بھی آجاتی ہے کچھ بھی ہو پہلی بار جو میں نے ایک بڑے جلسے میں مزاحیہ مضمون سنایا وہ میری زندگی کا ایک اہم اور کبھی نہ بھلایا جانے والا واقعہ ہے۔ اس نے جہاں مجھے پست ہمت کیا وہیں آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیا۔ اسکو میں خدا کی دین سمجھتی ہوں مستقل مزاجی سے لکھتی چلی جارہی ہوں

حیدرآباد کی سڑکیں

کبھی کسی نووارد کو آپ نے یہ پوچھتے سنا ہوگا "یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟" حیدرآباد کی ہر سڑک کے بارے میں اس سوال کا ایک ہی جواب ہے "یہ سڑک دواخانے جاتی ہے" گذشتہ چند برسوں میں ماہرین تعمیرات اور متعلقہ ذمہ دار افراد کی مہربانی سے حیدرآباد کی سڑکیں خستہ تر ہوگئی ہیں۔ سڑکوں کی تباہ حالی کی وجہ سے ٹائر ٹیوب والوں، ہڈی کے ڈاکٹروں اور جراحوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔ ہم جسے سڑک کہتے ہیں وہ کچرا، کیچڑ، کھڈے کھلے مین ہول اور چھوٹے بڑے پتھروں کے ڈھیر کا نام ہے۔ اکثر سڑکوں پر عرصہ سے بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے آنے جانے والی گاڑیاں، بے وقت، بے موقع گلے ملتی ہیں جس کے نتیجے میں ہر روز ہر سڑک پر کافی دیر تک راستے بند ہو جاتے ہیں۔ جن عورتوں کو ناف برابر کروانے کی لت ہے وہ سڑکوں سے بہت خوش ہیں۔ جراح اور لیڈی ڈاکٹرس دست بدعا ہیں کہ یہ سڑکیں یوں ہی خستہ رہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خدمت کا موقع دے سکیں۔ اکثر خواتین نو مہینے کے بجائے سات مہینے میں بچوں کو جنم دے رہی ہیں۔ میڈیکل ہال والے پریشان ہیں کہ درد نہ بڑھانے والی دوا بالکل فروخت نہیں ہو رہی ہے۔ حالانکہ حسب معمول آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے زچگی خانہ آنے والی ایک خاتون سے اس بارے میں استفسار کیا اس نے جواب دیا "میں نے

کوئی دوا استعمال نہیں کی صرف آٹو میں بیٹھ کر گھر سے یہاں آئی ہوں۔"

بڑھتی ہوئی آبادی پر ترس کھا کر سڑکوں کی کشادگی کا کام تیزی سے شروع کیا گیا۔ کسی کا صحن کم ہوا، کسی کا ورانڈہ آدھا ہوگیا تو کسی کا گھر، گھروا بن گیا۔ آناً فاناً تنگ سڑکیں کشادہ بن گئیں۔ لیکن ناجائز بچوں کی طرح ان سڑکوں کو کسی نے پسند نہیں کیا۔ اکثر سڑکیں ضرورت سے زیادہ چوڑی ہوگئی ہیں اس کے باوجود ہر کوئی ان سے اپنی گاڑی بچا کر پرانی سڑک پر چلنا ہی بہتر سمجھتا ہے۔

سارے شہر میں سڑک سے لگے ہوئے کچھ رستے ہیں۔ اردو زبان پر جان چھڑکنے والے ان راستوں کے لیئے انگریزی لفظ فٹ پاتھ استعمال کرتے ہیں۔ ان پر سے پیدل راہروں کے چلنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اتفاقاً کہیں فٹ پاتھ اچھی حالت میں ہیں تو وہاں ایسے بیوپاری مستقل رہتے ہیں جنھیں اور کہیں جگہ نہیں۔ یہ ان کی مجبوری ہے۔ روزگار کا مسئلہ ہے۔ اکثر جگہوں پر فٹ پاتھ خالی دیکھ کر لوگ چلنا چاہتے ہیں تو آگے ایک مٹی کا ڈھیر، لائٹ کا کھمبا یا پتھر پڑے ہوں گے۔ یہ نہیں تو ایک عدد گڑھا ضرور ہوگا۔

دکاندار روز اپنی دکان کے سامنے جھاڑو دیتے ہیں۔ بڑی خوشی ہوتی ہے کہ نہ صرف دکان بلکہ فٹ پاتھ پر بھی جھاڑو ہوتی ہے۔ لیکن جھاڑو کو سڑک پر پھرتے دیکھ کر خوشیوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ دکاندار کوئی غلط کام نہیں کرتے۔ وہ کچرے کو اپنے جائز مقام پر لاکر چھوڑ دیتے ہیں۔

سڑک کے کنارے کچرے کی کنڈی نام کی چیزیں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ ہمیشہ غلاظت سے بھری رہتی ہیں۔ اکثر کنڈیاں خوش قسمت ہیں اس لیئے کہ بعض لوگ کچرا کنڈی میں ڈالنے کے بجائے باہر ڈالتے ہیں۔ شہر کی سڑکوں میں جب سے لاتعداد گڑھے پڑ گئے ہیں کچرے کو کنڈی تک پہنچانے کے بجائے ان گڑھوں میں انڈیل دیا جارہا ہے۔

یہ سڑکیں انتہائی بے مروت ہیں۔ ان پر آئے دن لوٹ مار، قتل و غارت گری ہوتی ہے

دن دھاڑے منگل سوتر اڑاتے جاتے ہیں، راہ چلتی عورتوں اور لڑکیوں پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں کہتیں؟ کچھ نہیں کرتیں۔ کریں گی بھی کیا۔ یہ خود قابل رحم ہیں مصیبت زدہ ہیں۔ تنہا یہ کہ بے بسی ہیں یہ سڑکیں جنہوں ڈرینج کے آنسو روتی ہیں۔ ان کے یہ آنسو بہتے بہتے ناسور بن گئے ہیں۔ کوئی ان کا غمگسار نہیں کوئی چارہ ساز نہیں۔

انہیں بیل بھی انسان جیسے ہوگئے ہیں۔ انسانوں کی طرح بیچ سڑک پر کھڑے آنے جانے والوں کے لیئے رکاوٹ بنے رہتے ہیں۔ بیل بھٹے یا موز کے چھلکے کھانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ تو انسان کی کنگال نگاہیں ایسے عریاں پوسٹرس پر ہوتی ہیں جن کی کشش اسے سنیما ہال کے اندر پہنچاتی ہے بے وقوف نہیں جانتا کہ وہ سین فلم میں نہیں ہوتا۔ پوسٹرس دیکھ کر سنیما ہال کا رخ کرنے والوں پر بیل طنزیہ مسکراتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں یہ سین پکچر میں ہوتا تو ہم پہلے بنے یہاں کیوں کھڑے ہوتے۔

وہ سڑک انتہائی خوش نصیب ہے جس پر سے کسی مہاراجہ یا مہارانی کی موٹر پلک جھپکتے میں گذر جاتی ہے۔ ایک لمحہ سہی لیکن اس سڑک کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ راتوں رات کھڈوں میں مٹی پتھر بھر کر سڑک کو شاندار بنا دیا جاتا ہے۔ یہ شاندار سڑک جاندار نہیں ہوتی پھر بھی سڑک ہوتی ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ پہلی مرتبہ حیدرآباد کے لوگوں کا شعور بیدار ہوا ہے۔ سڑکوں کی تعمیر کے لیئے بھوک ہڑتال کر رہے ہیں، محضر بھیجے جا رہے ہیں۔ کچرے کے خوبصورت پارسل بنا کر متعلقہ افراد کے پاس بھیجنے کی دھمکی بھی دی گئی ہے۔ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ سڑک ضرور بنے گی لیکن راہ گذروں کی تسلی کے لئے بنے گی۔ اوپر سے تھوپی گئی مٹی اور فالتو ڈامبر اپنی اصلیت بہت جلد ظاہر کردیں گے۔ ڈامبر کی ہلکی پرت تلے دبے ہوئے پتھر پکار اٹھیں گے "ہمیں ان لاریوں سے بچاؤ"۔ آجکل لاریاں انسانی جسموں کو وحشیانہ طریقہ سے گھسیٹتی چلی جا رہی ہیں۔ پتھر تو پتھر ہیں سڑک پر خاموشی سے پڑے رہنے میں ہی ان کی بھلائی ہے۔

آٹو والے

زمانہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ تیز رفتار زندگی کے اس دور میں انسان میں وقت کی قدر کرنے کا کچھ تو سلیقہ آگیا ہے۔ وقت کی اس قدر کے لیے وہ عموماً بے بسی سے ہر آنے جانے والی بسوں کو دیکھنے کے بجائے آٹو میں سفر کرنے کو ترجیح دینے لگا ہے۔ سڑکوں پر جو آٹو چلتے دکھائی دیتے ہیں ان میں زیادہ تر انجن کی خرابی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لیے سماعی تکلیف دہ آوازیں نکالتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ ان کی ناقابلِ برداشت آوازوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ نہ آوازوں پر پابندی ہے نہ میٹر پر۔ آٹو اور اس کے میٹر کی چال میں فرق یہ ہے کہ آٹو چلتا ہے، میٹر بھاگتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خراب میٹر والے آٹو سے سابقہ پڑنے پر میٹر میں بڑھتے ہوئے روپیوں پر نظریں جم جاتی ہیں اور خون کے دباؤ میں کمی یا زیادتی کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ خوش قسمتی سے ہمیں نئے انجن والے آٹو میں سفر کرنے کا موقع ملا۔ ہماری مسرت کا ٹھکانہ نہ تھا۔ یقین نہیں آتا کہ ہم آٹو میں بیٹھے ہیں۔ نہ آٹو آواز کر رہا تھا نہ آٹو والا۔ ہم سے بولے بن رہا نہ گیا۔ ہم نے آٹو کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔

"آٹو کتنا اچھا ہے"۔

"ہاں آرام دہ بھی ہے"۔

"ذرا سی بھی آواز نہیں ہو رہی ہے"

جھٹکے بھی نہیں دے رہا ہے۔ ہمیں پہلی بار اتنے اچھے آٹو میں بیٹھنے کا موقع ملا۔"

یہ گفتگو آٹو والا سن رہا تھا۔ اس کا پیمانہ خاموشی لبریز ہو کر چھلکنے لگا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ آٹو کے ہینڈل سے مکمل طور پر ہٹا لیا جیب سے سرخ دستی نکالی اور آٹو کے سامنے لگے شیشے کو صاف کرنے لگا۔ اب ہماری خیر تھی۔ وہ خوشی میں مست تھا۔ آٹو کا شیشہ صاف کرنے کے بعد وہ اپنی ذات پر توجہ دینے لگا۔ یقین مانیے ہم نے صرف آٹو کی تعریف کی تھی۔ آٹو والے کی نہیں۔ لیکن اس نے باز و لگے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا ہاتھ سے بال برابر کئے اطمینان نہ ہوا تو کنگھا نکالا اور بال جمانے شروع کر دئیے۔ تھوڑی دیر کے لیئے اس کے دونوں ہاتھ آٹو کے ہینڈل سے الگ ہو جاتے۔ یعنی آٹو میں بیٹھنے والوں کو وہ مکمل طور پر خدا کی حفاظت میں دے دیتا۔ آٹو صاف کرنے اور بال سنوارنے کے بعد وہ ہم سے مخاطب ہوا۔ آپ نے جو تعریف کی اس کا شکریہ۔ "میرا آٹو اس سے بھی تیز چلتا ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے جل تو جلال تو پڑھتے رہنے کی ہدایت کی۔

اکثر آٹو والے انتہائی لاپرواہی اور تیز رفتاری سے آٹو چلاتے ہیں۔ ایسے آٹو میں بیٹھتے ہی زندگی اور موت کا فلسفہ یاد آجاتا ہے۔ یعنی زندگی ناپائیدار ہے اور آٹو میں موت یقینی ہے۔ اس کے باوجود آٹو میں مرنے کے بجائے گھر میں مرنے کو ترجیح دیتے ہوئے ہم آٹو والے سے رفتار کم کرنے کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی تیز رفتار آٹو کا ذکر ہے جس سے ہمیں سابقہ پڑا تھا۔ اس کے بریک بھی غالباً کنٹرول میں نہیں تھے۔ برق رفتاری سے چلتے ہوئے اس نے ایک ٹیکسی کو ٹکر دے دی۔ زور دار بریک جو پڑا تو ہمارے دونوں گھٹنے سامنے لگے لوہے کے ڈنڈے سے جا لگے۔ شدید تکلیف پر قابو پاتے ہوئے ہم نے آٹو والے سے کہا "میرے دونوں گھٹنے پھوٹ گئے ہیں، آٹو کی رفتار ذرا دھیمی کر دو۔ اس نے آٹو کی رفتار اور تیز کر دی۔ جھنجلا کر کہنے لگا "آپ کے گھٹنے پھوٹے ہیں مجھے تو سر پر مار لگی ہے میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے اس ٹیکسی والے کو

پکڑنا ہے جسے میں نے ٹکر دی تھی"۔ اس کے بعد آٹو والے نے آٹو کی رفتار اور تیز کر دی اور اس وقت تک ٹیکسی کا پیچھا کیا۔ جب تک کہ دونوں کے راستے نہ بدل گئے۔

ہماری کچھ عادت سی ہو گئی ہے آٹو میں بیٹھتے ہی آیۃ الکرسی پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اس دن بھی پڑھ رہی تھی۔ ٹیکسی سے ٹکرا کر جب آٹو رک گیا تھا اس وقت رفتار کم کرنے کی درخواست پر آٹو والے نے غصے سے کہا تھا۔ " اتر کر آٹو کے پیچھے لکھا ہوا شعر پڑھیئے۔ آٹو پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

موت کو میں گلے لگاؤں گا • زندگی تیرا اعتبار نہیں۔

اس شعر کے پڑھنے کے بعد لاشعوری طور پر ولا یؤدہ حفظہما وھو العلی العظیم کے بجائے باآواز بلند ہم نے یہ مصرعہ دہرانا شروع کر دیا۔

موت کو میں گلے لگاؤنگی، موت کو میں گلے لگاؤنگی

بازو بیٹھے ہوئے ہمارے بچے نے پوچھا "ماں! آپ کیا پڑھ رہی ہیں"؟ ہم نے کہا "آیۃ الکرسی" بچے کو یقین ہو گیا کہ خلل دماغ کی یہ پہلی خطرناک علامت ہے۔ ہمارے منع کرنے پر بھی بعد میں رازدارانہ طور پر دماغ کے ڈاکٹر سے ہماری دماغی حالت کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ آٹو کے شعر پر یاد آیا۔ ایک آٹو پر لکھا تھا ؎

آج عمل ہے حساب نہیں • کل حساب ہے عمل نہیں

تشریح :- آٹو والا پولیس والے سے کہہ رہا ہے کہ مسافر کی مجبوری سے فائدہ اٹھا لے۔ اسے دھوکہ دینے اور سامان لے کر چلتے بننے کا آج ہی کا دن ہے۔ آج کوئی پوچھنے والا نہیں۔ آج عمل کا دن ہے البتہ کل حساب ہوگا۔ یعنی آپ مجھے تلاش کرنے نکلیں گے۔ اسی لیے جو کرنا ہے آج ہی کر لینا چاہیئے!

ایک آٹو پر لکھا تھا ؎

موت کیا شئے ہے تم کو کیا سمجھائیں ہم • راستے میں مسافر کو نیند آگئی

تشریح :- آٹو والا مسافر سے کہتا ہے کہ لفظ معت کی تشریح میں کن الفاظ میں کروں " راستے " کا استعمال یہاں ذو معنی ہے۔ جس طرح دنیا سے آخرت تک کے سفر میں کسی بھی وقت آدمی کا آنکھیں موند لینا یقینی ہے۔ اس طرح میرے آٹو میں بیٹھنے کے بعد کسی موڑ پر کسی چوراہے پر مسافر کو نیند آسکتی ہے۔ نیند سے مراد یہاں ابدی نیند ہے۔

اس قسم کے ہمت دلانے والے اشعار آٹو پر خوش خط لکھے ہوئے ہیں۔ آٹو والے آٹو کی فنی خرابی کو کبھی دور نہ کریں گے۔ نہ آٹو صاف رکھیں گے نہ اپنی زبان۔ اپنے یونیفارم کی صفائی اور اپنے اخلاق پر کبھی توجہ نہیں دیں گے۔ لیکن جہاں تک موزوں اشعار کا تعلق ہے ان کے انتخاب میں پوری توانائیاں صرف کر دیتے ہیں۔

آٹو والوں سے جن لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے ان ہی کے دل جانتے ہیں کہ یہ مسافرین سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ ایک دفعہ ہماری اسکوٹر کی اگلی سیٹ بیمار تھی ہمیں باہر جانے کے لئے بہت زیادہ پریشانی اس لئے نہیں ہوئی کہ اس ہفتہ آٹو والے اپنے اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے لیے ہفتہ خوش اخلاقی منا رہے تھے۔ ایک آٹو میں بیٹھ کر ہم نے خوشی خوشی کہا۔ " رانی گنج " آٹو والا مسکرایا۔ انتہائی خوش اخلاقی سے بولا " فوراً اتر جائیے میڈم " مجھے اس طرف جانا نہیں ہے "۔ اتفاق سے اسی دن ایک آٹو والے نے قسم کھائی تھی کہ وہ بات نہیں کرے گا اور منہ پر پٹی باندھ کر آٹو چلائے گا۔ ہم اس آٹو میں بیٹھ گئے۔ منزل مقصود پہنچ کر ہم نے میٹر کے مطابق کرایہ اس کی طرف بڑھایا آٹو والے نے سامنے چاقو کے ساتھ لگی پرچی کی طرف اشارہ کیا جس پر لکھا تھا " میٹر سے تین روپے زائد دے کر خاموشی سے چلتے بنو ورنہ بعد میں خیر نہیں "۔

ہر آٹو والے کی اپنی ایک مخصوص پالیسی ہوتی ہے۔ مسافر سے بات کرنے کا علحدہ ڈھنگ ہوتا ہے بعض مسافرین کو خاموشی سے آٹو میں بٹھا لیتے ہیں۔ راستہ بھر کسی قسم کی حجت نہیں کرتے لیکن جب کرایہ لینے کا وقت آتا ہے تو ان کے تیور ہی بدل جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے پاس کچھ مہمان آٹو میں آئے۔ آٹو والا ان سے زور دار آواز میں تکرار کر رہا تھا۔ " چار روپے زیادہ رکھ دیجئے

"ارے تو ہوتا کیا؟ تین سواری بول کے چھ بیٹھ گئے" ۔ ہم نے تعجب سے کہا "چھ کہاں ہیں، تین ہی تو ہیں" ! وہ غصے سے کہنے لگا ۔ "قوال اوڑھے ہوئے تین بچے اور ان کے باسکٹ ملا کر چھ نہیں ہوئے؟ کوئی آٹو والا ہوتا تو بتا دیتا" ۔ ہم نے پوچھا پھر تم کون ہو؟ اس نے ٹری کاٹ کے شرٹ کے کالر کو سیدھا کرتے ہوئے کہا "میں آٹو والا نظر آرہا ہوں؟ آٹو کا مالک ہوں" ہم نے سوچا یہ بہت بک بک کر رہا ہے اسے پولیس اسٹیشن کی دھمکی دینی چاہیے ۔ "پولیس اسٹیشن چلو وہیں بات کریں گے" ۔ وہ اطمینان سے بولا کون ڈرتا ہے پولیس والوں سے ان کو معمول چپ نہیں دیتے ہم" ۔

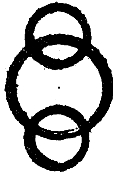
ہم نے زیر لب کہا "معمول لینے والوں کا علاج کرنے والا غیر معمولی ڈاکٹر اب آگیا ہے" ۔

ننانوے فیصد آٹو والے بڑے ہمدرد ہوتے ہیں ۔ یہ دوسروں کے آڑے وقت کام آنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے ۔ کسی لڑکی کے اغوا کا معاملہ ہو یا کسی کو دور لے جاکر قتل کرنے کا منصوبہ، ان کا بھرپور تعاون رہتا ہے ۔ اکثر حاضر دماغ مسافر آٹو کے پچھلے حصے میں بھاری کپڑوں کا سوٹ کیس، زیورات کا بریف کیس اور اسی قسم کا قیمتی سامان رکھ کر اتر جاتے ہیں ۔ بعد میں اخبار میں "سامان کی گمشدگی" کے زیر عنوان آٹو والے کو اطلاع دیتے ہیں ۔

"ایک عدد سوٹ کیس جس میں بھاری کپڑے تھے اور زیور کا بریف کیس میں آٹو میں رکھ کر اترتے وقت لینا بھول گیا ۔ آٹو والے صاحب سے درخواست ہے کہ نیچے دئے ہوئے پتے پر سامان پہنچا دیں ۔ سواری خرچ کے علاوہ پچاس روپے انعام بھی دیا جائے گا" ۔

کون سا بے وقوف آٹو والا ہوگا جو اپنا قیمتی وقت برباد کرکے ہزاروں روپے کا سامان واپس دے کر پچاس روپے خیرات لے جائے گا ۔ آٹو کے پچھلے حصے میں وہ سامان اسی لیے سلیقے سے جاکر رکھتا ہے کہ مسافر اسے وہیں چھوڑ کر غفلت میں اتر جائے ۔

ایک فیصد آٹو والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہزاروں کا سامان آٹو میں رکھا دیکھ کر چین سے سو نہیں سکتے۔ ساری رات بے چینی سے ٹہل کر وہ صاحب سامان تک سامان سمیت پہنچ جاتے ہیں اور انعام میں دیا ہوا پچاس یا سو روپے کا نوٹ بھی واپس کر دیتے ہیں۔ اگر سبھی آٹو والے ایسے ہو جائیں تو سمجھئے کہ قیامت قریب ہے۔



چلّر

ریزگاری کی قلت آج کا اہم ترین موضوع ہے۔ جو لوگ سیاست سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی سیاسی موضوعات پر اوٹ پٹانگ باتیں کر کے بظاہر دوسروں پر رعب جماتے اور حقیقت میں خود بے وقوف بنتے وہ بھی اب ریزگاری کو اپنا موضوعِ سخن بنائے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں تو چلر دیکھنے کو نہیں ملتا۔ جوتے، چپل، کپڑے اور دوسرے دکان والے اپنا حساب کتاب روپیوں ہی میں رکھتے ہیں۔ کہیں ساٹھ ستر پیسے بڑھ جائیں تو وہ فراخدلی سے گاہک کو معاف کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی نوٹ ذرا بھی داغ دار ہو تو فقیر، دکاندار، چھوٹے بچے، آٹو والے، پوسٹ آفس والے سبھی لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن کراچی میں یہ مسئلہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ کم سے کم خیرات ایک روپیہ ہے۔ یعنی وہاں کے لوگ ایک کا نوٹ خیرات کرتے ہیں۔ پان کھا کر ۵ روپے کے نوٹ سے ہاتھ پر لگا کتھا چونا صاف کرتے ہیں اور دس کے نوٹ سے منہ پونچھتے ہیں۔ ان رنگ برنگی پھٹے پرانے نوٹوں کو لینے سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔

جیسا کہ میں نے لکھا ہے پاکستان میں کم سے کم خیرات ایک روپیہ ہے۔ ایک دفعہ ہم وہاں کے ایک شاپنگ سنٹر کے پاس موٹر میں بیٹھے پنجابی لسی پی رہے تھے ایک خوش پوشاک فقیر نے ہاتھ پسارا ہم نے شان سے پرس میں سے ایک اٹھنی نکالی اور اسکی

طرف بڑھاتے ہوئے دعاؤں کا انتظار کرنے لگے۔ اٹھنی دیکھتے ہی اچھی خاصی فقیرنی آن کی آن میں شیرنی بن گئی۔ ہماری مٹھی اٹھنی سمیت بند کر کے اوپر ایک روپیہ رکھ کے یہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی "چلو چالیس چھوڑو اور خیرات کرنا سیکھو"۔ اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی فقیرنی کو ہم نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ چلو نہیں ہے تو جواب ملا "موٹر سے اترو اور میرے ساتھ چلو"۔

موجودہ دور میں ساٹھ ستر پیسے کی تو بات ہی چھوڑیئے، سو روپے کا نوٹ ایسے ختم ہو رہا ہے جیسے کچھ برس پہلے دس روپے کا ہوتا تھا۔

ایک بار عب صدر خاندان کے پاس دو بچوں نے ملازمہ کو بھیجا کہ پیسے مانگ کر لائے۔ ملازمہ گئی، با ادب کھڑی ہوئی اور کہا سرکار! بڑے بابا، منجھلے بابا چار چار پیسے منگوا رہے ہیں۔ یہ سن کر انہیں غصہ آگیا جھلا کر کہا حرام زادوں کو کچھ کام نہیں ہے چار چار پیسے لے کر آخر کیا کریں گے۔؟ ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا "کچھ تو بھی کھاتے بول رہے ہیں"۔ "کچھ تو بھی کھاتے لاؤ کر سن کر وہ آگ بگولہ ہو گئے کہنے لگے "گو کھاؤ بول۔ میں چار پیسے چھوڑ کر ایک دھیلا بھی نہیں دیتا"۔ یہ آج سے ۵۰ سال پرانا واقعہ ہے جب بچے چار پیسے میں نوکرے والی سے سب کچھ خرید کر کھا بھی لیتے تھے۔ بڑھتی گرانی کے اس دور میں وہ دن بھی دور نہیں جب بچہ باپ کی پیٹھ پر جھولتے ہوئے کہے گا۔ بابا، بابا! سو روپے دیجیئے نا"۔ باپ شفقت سے پوچھے کا کیا کرو گے بیٹے سو روپے لے کر۔ وہ لاڈ سے جواب دے گا "کچھ تو بھی کھاؤں گا"۔

ہمارے پاس ایک فقیرنی آتی تھی۔ گھر پر آتے ہی وہ بغیر دم لیئے لمبی لمبی دعائیں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ کچھ اس انداز سے شروع ہوتی "جرات بھری مراد، اللہ کے نام پر خیرات کرو" اللہ تمہاری شرافت، سخاوت، حماقت میں ترقی دے۔ اس قسم کی خطرناک دعاؤں سے بچنے کے لیئے ہم جلدی سے کھانا سالن، پانی اور پیسے سب ایک

ساتھ لے جاکر اس کے سامنے رکھ دیتے تاکہ وہ زبان کو لگام دے اور کھانے میں مصروف ہوجائے لیکن وہ بڑی ڈھیٹ تھی۔ کھانا کھاکر ڈکار لینے کے بعد وہ بڑے آرام سے بیٹھ جاتی، پھر کپڑوں کی فرمائش کرتی۔ "اپنے لیے، اپنے چہیتے بوڑھے فقیر کیلئے پاجامہ تو تیری کے لیئے۔ وہ نہ وقت دیکھتی نہ موقع، اس لئے اس سے چھٹکارا پانے کے لیے، ہم نے اس سے ہاتھ جوڑکر کہا تھا ہر مہینے کی صرف پہلی جمعرات کو آجایا کرے، ہم منہ مانگی خیرات دے دیا کریں گے لیکن اب کچھ دنوں سے ہم اس سے درخواست کر رہے ہیں کہ ہمارے گھر کے دروازے ہمیشہ اس کے لیئے کھلے ہیں۔ جب فرصت ملے آجایا کرے' اس فقیرنی کے آتے ہی ہم اسے پیٹ بھر کھانا کھلا دیتے ہیں۔ پھر اس کا ہاتھ دھلاکر برتن اٹھاتے ہیں۔ نذرانے کے طور پر کپڑے پیش کرتے ہیں پھر اسے ایک روپیہ دے دیتے ہیں۔

جوں ہی وہ روپیہ لے کر پیسوں کی تھیلی نکالتی ہے ہماری ترسی ہوئی نگاہیں اس کے جمع کئے ہوئے چلر پر پڑتی ہیں۔ عید پر نئی ساڑی دینے کا وعدہ کرکے بہلا پھسلا کر چلر مانگ لیتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار وہ آتی ہے۔ اب ہمارا یہ حال ہے کہ چلر لینے سے پہلے ہی دس کا نوٹ کاغذ میں لپیٹ کر رشوت دینے کے انداز سے اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں وہ چلر گنتی ہے ہم فرط مسرت سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پسار دیتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ایک دفعہ ہمارے اوپر والے فلیٹ میں رہنے والی لڑکی اپنی ماں سے کہہ رہی تھی' امی امی جلدی آئیے۔ ایک فقیرنی آنٹی کو اتنی بہت سی خیرات دے رہی ہے۔

حیدرآباد کی ایک روایت رہی ہے کہ سینما گھروں میں کسی پسندیدہ منظر یا ڈانس کے پیش کئے جانے پر چلر اچھالا جاتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ سے یہ روایت دم توڑ چکی ہے۔ رام تیری گنگا میلی جیسی فلم کے عریاں سے عریاں سین دیکھ کر لوگ چلر اچھالنا تو کجا سیٹی بجانا بھی بھول گئے ہیں۔ چلر اس لیے نہیں اچھالتے کہ وہ خود چلر ہوگئے ہیں۔

رہا سیٹی بجانے کا سوال تو ایسے مناظر دیکھ کر بعض شریف ناظرین کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ اس نیم عریاں عورت کو دیکھ کر انہیں اپنی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کا خیال آجاتا ہے۔ میں اس وقت کا انتظار کر رہی ہوں جب ان کا ضمیر ان پر ملامت کرے گا۔ اور وہ اس کے لیئے شدید قسم کا احتجاج کریں گے۔ اکثر سنتے ہیں کہ فلاں فلم سے فلاں فلاں سین نکال دیئے جانے والے ہیں۔ کچھ دن نمائش کرکے اعلان کرنے کا مطلب یہی ہے کہ وقت کو غنیمت جانو، جلدی سے آنکھیں سینک لو۔

آج کل ریزگاری کچھ اس طرح واپس ملتی ہے۔ گرانڈ مرچنٹ کو سو روپے کا نوٹ دیں تو تیس روپے اور ایک کیڈبری، میڈیکل ہال والے کو چلر واپس کرنا ہو تو دو روپے دے کر یہ گاتے ہوئے دو وِکس کی گولیاں ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ "وِکس کی گولی لو کھچ کھچ دور کرو"۔

ہوٹلوں میں سگریٹ کی ڈبی کے ٹکڑے پر کچھ لکھ کر دیتے ہیں۔ کنڈکٹرس اس معاملے میں بہت فائدے میں ہیں۔ ابتداء میں چلر نہ دینے پر مسافر کو خوب ملامت کرتے ہیں۔ پھر روپیہ لے کر ٹکٹ کے پیچھے لکھ کر دے دیتے ہیں۔ اور جب مسافر کے اترنے کا وقت آتا ہے تو بس کی بھیڑ میں دور کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کا بیگ چلر سے بھرا ہوتا ہے ریزگاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوتا ہے کہ جو لوگ محض لڑکیوں کو گھورنے اور انہیں دھکے مارنے کے لئے بس میں سفر کرتے تھے وہ اب کنڈکٹر کی قربت کو پسند کرنے لگے ہیں اور ان کی کنکھیاں نگاہیں لڑکیوں کے بجائے کنڈکٹر کے بیگ پر رہنے لگی ہیں۔

چلر واپس کرنے کا سب سے نرالا انداز آٹو والوں کا ہے۔ یوں تو وہ سال میں ایک مرتبہ ہفتہ خوش اخلاقی مناکر باقی دنوں میں اپنے بداخلاق ہونے کا مکمل ثبوت دیتے ہیں لیکن

مسافر بٹھاتے وقت وہ انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں جیب میں ہاتھ ڈالکر
بہت ہی شریفانہ اور مخلصانہ انداز میں کہتے ہیں " چلر نہیں ہے صاحب " اس طرح
بغیر جھگڑا کئے ہر مسافر سے روپیہ ڈیڑھ روپیہ زائد لے ہی لیتے ہیں۔

بہرحال ہر ذی شعور چلر جمع کرنے کی دھن میں ہے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ اپنے
پاس سے چلر نکالے اور خرچ کرے۔ جوں ہی میں نے یہ مضمون مکمل کیا، اخبار کی سرخی
پر نظر پڑی، وزیر فینانس نے یہ خوش خبری دی ہے کہ مارچ ۱۹۸۶ء تک ریزگاری
کی قلت دور ہوجائے گی۔ خوش خبریوں اور اعلانوں کے سوا یہ لوگ اور دے بھی
کیا سکتے ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہونے والا ہے یہ وقت ہی بتائے گا۔ فی الحال تو ہم سب کو
اپنا موجودہ رویہ ہی برقرار رکھنا چاہیئے۔ ○○

جہیز کی لعنت اور سماج

جہیز دینے کا رواج عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے۔ لوگ اپنی استطاعت کے مطابق لڑکی کے لئے جہیز جوڑنا شروع کر دیتے تھے لیکن لڑکے والوں کی طرف سے یہ پوچھا نہیں جاتا تھا کہ جہیز میں کیا کیا چیزیں دی جا رہی ہیں لیکن اب حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ لڑکی کو دیکھنے اور رشتہ طے ہونے سے قبل ہی جہیز کی فہرست مانگنے کا چلن عام ہو گیا ہے۔ لوگ ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ اسے معیوب بھی نہیں سمجھتے۔ مشاطہ کے ذریعہ جہیز کی فہرست منگوائی جاتی ہے۔ اس فہرست میں فریج، ٹی وی، صوفہ سیٹ، الماری، سنگھار میز، کھانے کی میز، ڈنر سیٹ، گنگال سماور اور دیگر اشیاء کے علاوہ کپڑے اور سونے کی مقدار لکھنی پڑتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اکثر گھروں میں یہ عمل دہرایا جا رہا ہے کہ سسرال والے چاہتے ہیں زیور اور دیگر اشیاء کا انتخاب وہ خود کریں۔ مخصوص کمپنیوں یا دکانوں کی نشاندہی کر کے اصرار کرتے ہیں کہ وہ ساتھ چلیں گے۔ وہی چیز لی جائے گی جسے وہ پسند کریں گے۔ بعض وقت کی مثالیں میرے سامنے موجود ہیں۔ لڑکی والوں نے لڑکے کے ظاہری ٹھاٹ اور اس آبائی جائیداد سے مرعوب ہو کر اپنی لڑکی دے دی۔ ابتداء میں تو ان لوگوں نے جوڑے جہیز، زیور وغیرہ سے لاپرواہی اور بے نیازی ظاہر کی لیکن جوں جوں شادی کی تاریخ آتی گئی انہوں نے فرمائشوں کا اتنا ڈھیر لگا دیا کہ لڑکی والوں کو مجبوراً اپنی جائیداد

فروخت کر دینی پڑی۔

بھیک مانگنے والے کا ہاتھ ہمیشہ پھیلا ہی رہتا ہے اس کی جھولی کبھی نہیں بھرتی۔ یہی حال جہیز مانگنے والوں کا بھی ہے۔ شاعری میں محبوب کی زلف یا جدائی کی رات کا جو تصور ہے اس کا اطلاق جہیز کی فہرست پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

جہیز کی فہرست مانگنے والوں کو فہرست کچھ اس طرح دی جا سکتی ہے۔

۱۔ ڈیڑھ گز کوری چادر

۲۔ سلور کی پرانی رکابی۔ چادر اوڑھنے کے لیے اور رکابی ہاتھ میں لے کر گھر گھر بھیک مانگنے کیلئے، ۲ جوڑ پرانی چپلیں، چلو بھر پانی ڈوب مرنے کے لئے۔

شادی اب اکثر گھرانوں میں لڑکے اور لڑکی کے ازدواجی بندھن میں بندھے جانے کا نام نہیں رہی۔ بنیادی اہمیت لین دین اور دیگر لوازمات کو دی جانے لگی ہے۔ ایک گھرانے میں شادی کے شرائط یعنی جوڑے کی رقم، جہیز کی فہرست وغیرہ طے ہونے کے بعد جب سانچق کی رسم کا دن آیا تو لڑکی والوں نے چائے کا اہتمام کیا اور سمدھاوے سے آنے والوں کی تعداد پوچھی۔ اس پر وہاں سے جواب ملا "جب سے رشتہ طے ہوا ہے آپ لوگوں نے ایک دن بھی کھانا نہیں کھلایا کم از کم سانچق کے دن کھانا کھلایا جائے" لڑکی کے باپ کو غصہ آ گیا انہوں نے کہلوایا "کھانا تقسیم کر دوں گا اپنے اپنے برتن ساتھ لائیں"۔

مختلف اخباروں اور رسالوں کے تراشے میرے سامنے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں ایسے ظالم اور لالچی لوگ موجود ہیں جو روپے پیسے کے آگے کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ عذاب الٰہی سے بے خبر ایسے کام کئے جا رہے ہیں۔ دلہنوں کو جسمانی اور روحانی اذیتیں پہنچانے اور انہیں جلا کر مار ڈالنے کے واقعات عام ہو چلے ہیں۔

حال ہی میں ٹی وی پر ایسی خواتین کا انٹرویو لیا گیا تھا جنہیں سسرال والوں نے جلا کر

ختم کر دینے کی کوشش کی تھی جو ادھوری رہ گئی ۔ ان خواتین کے چہرے جھلسے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے والدین نے اپنی استطاعت اور وعدہ کے مطابق سب کچھ دیا۔ اس کے باوجود سسرال والے ان سے کبھی مطمئن اور خوش نہ رہے ۔ ہر سال کتنی عورتیں ایسی ہیں جنہیں زندہ جلایا جارہا ہے یا جہیز نہ لانے یا جہیز کم لانے کا طعنہ دے کر انہیں مختلف قسم کی اذیتیں پہنچائی جارہی ہیں ۔

۵۴ ویں کل ہند ڈیمنس کانفرنس کے افتتاح کے موقع پر مملکتی وزیر بہبودی خواتین نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ مرکزی حکومت نے خواتین کی رضاکارانہ تنظیموں کو جہیز کی وجہہ سے جو اموات واقع ہو رہی ہیں اس کی تحقیقات کیلئے تحقیقاتی ایجنسیوں کا موقف دینے قانونِ انسداد جہیز میں ترمیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ انسداد جہیز کے لیئے قوانین بنائے جارہے ہیں حکومت اس کے لئے اقدام کررہی ہے ۔ لیکن صرف حکومت کو اس کا ذمہ دار قرار دینا ٹھیک نہیں ۔ سماج سے جہیز کی لعنت بالکلیہ طور پر ختم ہوسکتی اس کے لیئے نوجوان نسل کو راست قدم اٹھانا ہوگا ۔ لڑکیوں کے لئے بھی یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے کہ وہ اس بارے میں اظہار خیال کریں ۔ جہیز مانگنے والے گھرانوں کا مکمل بائیکاٹ کیا جانا چاہیئے۔ چند دنوں سے ایک بات میرے ذہن میں بس گئی وہ یہ کہ میں اکثر سوچتی ہوں آجکل کے لڑکے خواہ وہ کالج کے ہوں یا یونیورسٹی کے ذراسی بات منوانے کے لئے مارنے مرنے تیار ہوجاتے ہیں ۔ توڑ پھوڑ مچاتے ہیں ۔ نعرے بازیاں کرتے ہیں ۔ دیواروں پر پوسٹرس لگاتے ہیں یہی لڑکے اپنے والدین کی ذہنیت کو بھی بدل سکتے ہیں ۔ یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے متعلقہ اور ملحقہ کالجوں کے طلباء سے میں خصوصیت سے مخاطب ہوں ۔ جہیز کی بڑھتی ہوئی لعنت کو جڑ سے مٹانے میں ان کا بھرپور تعاون رہے تو پھر لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا ہے ۔ جو توڑ پھوڑ اور مارپیٹ وہ کالج میں کرتے ہیں، جہیز کے

خلاف اسی عمل کو اگر اپنے اپنے گھروں میں دہرائیں تو جہیز کی مانگ کرنے والی مائیں منٹوں میں درست ہوسکتی ہیں اگر طلباء میری درخواست پر سنجیدگی سے غور کریں اور متحد ہوکر جہیز کے خلاف آواز اٹھائیں تو سماج سے یہ لعنت بالکلیہ طور پر دور ہوسکتی ہے۔ کچھ تجاویز پیش کررہی ہوں۔ جہیز مانگنے والی لالچی خواتین یقیناً ان تجاویز کو سن کر چراغ پا ہوں گی لیکن بعد میں اپنی غلطی پر خود ہی نادم ہوں گی۔ لڑکیاں اور خصوصاً کالج کی طالبات پہل کریں۔ اور بلا خوف و خطر بلکہ بلا جھجک اعلان کردیں کہ جہیز کی مانگ کرنے والے گھرانے کی بہو بن کر وہ ہرگز نہ جائیں گی اس طرح جہیز مانگنے والوں کو دو چار سال تک ہر گھر سے نفی میں جواب ملے گا اور ان کی چہیتی اولاد کی کنپٹیاں چمکنے لگیں گی تو ان خواتین کے دماغ ٹھیک ہوجائیں گے۔ اسی طرح لڑکے ایک انجمن بنائیں۔ اپنی ماؤں کو پابند کریں کہ وہ جوڑے کی رقم اور جہیز کا مطالبہ نہ کریں گی۔ جلسے تو ہر قسم کے ہوتے ہیں کچھ جلسے اس نیک اور بامقصد کام کے لیے بھی مختص کردیں سال میں کم از کم دو مرتبہ بڑے پیمانے پر ایسے جلسے منعقد کریں ان میں مختلف طبقات کی نمائندگی کرنے والے دانشوروں کو مدعو کریں۔ ان سے خواہش کریں کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات لوگوں تک پہنچائیں اور جہیز کی لعنت کو ختم کرنے کی تجویزیں سامنے رکھیں۔ اس کے بعد طلبار بھری محفل میں اپنے ناموں کا اعلان کریں اس عہد کے ساتھ کہ وہ جوڑے کی رقم اور جہیز کا مطالبہ نہ کریں گے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اخبارات کے ہفتہ وار خصوصی ایڈیشن میں وہ اپنے نام، قابلیت، پتہ اور دوسری ضروری تفصیلات شائع کرواتے جائیں اس سے لڑکی والوں کو موزوں لڑکوں کے انتخاب میں سہولت ہوگی اور ہزاروں لڑکیاں جو محض منہ مانگا جہیز ساتھ نہ لے جاسکنے کی وجہ سے میکے میں ہیں، سسرال جاکر اپنا اور ان کا گھر بسا سکیں گی۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ لالچی عورتوں کے ذہن کو بدلا جائے ان میں اتنا شعور اور احساس پیدا کیا جائے کہ وہ جو کام کررہی ہیں وہ سماج کیلئے ایک بدنما داغ ہے۔ جہیز مانگ کر لینا اور اس کی نمائش کرنا یا ایک ایک سے کہتے پھرنا کہ بہو اتنا سارا جہیز لائی ہے سوچیئے تو کتنی بے شرمی کی بات ہے۔ میں پھر ایک بار یاد دہانی کرتی ہوں کہ یہ کام کسی ایک کے بس کا نہیں۔ جہیز کی لعنت کو سماج سے ختم کرنے کیلئے سب کا تعاون ضروری ہے۔ ••









مزاح نگاری کیلئے چیتے کے جگر اور شاہین کے تجسّس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزاح دراصل دو دھاری تلوار ہے جو مسرت بھی بخشتا ہے اور بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔ کہیں زخم جگر کے ٹانکے ہنسی ہنسی میں ٹوٹتے ہیں۔ مزاح نگار سماج کی ناہمواریوں، بنی نوع انسان کی کمزوریوں کو جس لطیف انداز میں بیان کرتا ہے وہ ناصح، مشفق یا رہنمائے قوم کے بس کا روگ نہیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء تلوار کی اس کاٹ سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے بڑے لطیف پیرائے میں سماج اور فرد دونوں کی فروگذاشتوں کا احاطہ کیا ہے۔ ان کے کئی مضامین لطافت اور صداقت کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔

روزمرہ کے مشاہدات اور زندگی کے حقائق کو مزاح کے روپ میں ڈھالنا اسچھے مزاحیہ ادب کی شناخت ہے۔ بہت کم خواتین ادب کی اس مخصوص صنف میں اپنے جوہر دکھا رہی ہیں۔

سرزمین حیدرآباد نے جہاں ادبی دنیا کو اعلیٰ پایہ خواتین ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر محقق، نقاد بخشے وہیں امید بندھتی ہے کہ مزاح نگاری میں حیدرآبادی خواتین اپنا مقام پیدا کریں گی۔ اس صنف ادب کو ڈاکٹر حبیب ضیاء سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے کے مصداق ڈاکٹر حبیب ضیاء اسی طرح کے ستھرے مزاحیہ ادب کی تخلیق کرتی رہیں گی

پروفیسر رفیعہ سلطانہ
سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، جامعہ عثمانیہ

ملک میں خاتون مزاح نگاروں کی کمی ہے۔ جسکی وجہہ سے مرد مزاح نگار سکون واطمینان کے ساتھ بلا خوف وخطر طنز ومزاح کے میدان پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ ویسے چند خواتین جو دیگر اصناف ادب میں اپنے فن کے جوہر دکھارہی تھیں، طنز ومزاح کے میدان میں بھی ہاتھ پاؤں مارنے کیلئے اتریں لیکن دو چار قلابازیاں کھانے کے بعد پورے خشوع وخضوع اور حضور قلب کے ساتھ توبہ کرکے اپنے اصلی میدان میں واپس چلی گئیں۔ البتہ شفیقہ فرحت اپنی پوری ہمت "زنانہ" کے ساتھ ڈٹی ہوئی ہیں۔

اب جو ڈاکٹر حبیب ضیاء طنز ومزاح کے میدانِ کارزار میں پورے ہتھیاروں سے لیس ہوکر اتری ہیں تو زندہ دلان حیدرآباد کیلئے خطرے کی گھنٹی ہے کہ خبردار اب وہ وقت آگیا ہے کہ اقلیم طنز ومزاح پر خواتین کا قبضہ ہونے والا ہے۔ اور تم لوگ مجاہدین کی طرح چھاپہ مار جنگیں لڑتے رہ جاؤ گے۔ (ویسے سیاسی جنگ تو عرصہ ہوا کہ مرد ہار چکے ہیں) موصوفہ کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "گویم مشکل" اردو اکیڈیمی آندھراپردیش اور ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ کی اعانت سے شائع ہوا ہے جو ادب کی اس صنف میں قابل قدر اضافہ ہے۔

طنز ومزاح کے بارے میں میرے ذاتی خیالات وہی ہیں جو مغربی مصنفین کے ہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ غلامانہ ذہنیت ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک کے مشہور ومعروف مزاح نگاروں نے بھی مغربی انداز فکر سے استفادہ کیا ہے۔ غرض میرا یہ ایقان ہے کہ چاہے افسانوی ادب ہو یا طنز ومزاح اس کی بنیاد چار خصوصیات پر رکھی جاتی ہے۔

پہلی خصوصیت "زبان" ہے جو فنکار کا ہتھیار ہے۔ اس کے بغیر فن کار تنہا میدان میں

اثر ہی نہیں سکتا اس خصوص میں ڈاکٹر حبیب ضیاء اردو کی سند رکھتی ہیں جس طرح میڈیکل کالج سے کسی ڈاکٹر کو ایم بی بی ایس کی سند عطا کر کے یہ اجازت دے دی جاتی ہے کہ جاؤ لقمان اب تم جتنے چاہو قتل کر سکتے ہو۔ تم پر کوئی عدالت مقدمہ نہیں چلا سکتی۔ اسی طرح ڈاکٹر حبیب ضیاء کو بھی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کر کے یہ اجازت دے دی ہے کہ۔ جاؤ خاتون اب تم جتنی چاہو زبان کی غلطیاں کر سکتی ہو۔ کوئی برق آشیانوی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن ان کی نادانی پر افسوس ہوتا ہے کہ اس جائز حق سے پوری کتاب میں انہوں نے کہیں ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔

دوسری خصوصیت "زندگی" یعنی "Life" ہے جو ڈاکٹر ضیاء کے جیتے جاگتے چلتے پھرتے زندہ (بلکہ بعض زندہ درگور) کرداروں میں رچی بسی نظر آتی ہے۔ کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جو زندگی کے حقائق کے غائر مطالعہ سے عاری ہو۔ جن مضامین میں یہ بات شدت سے نظر آتی ہے وہ ہیں "بچہ باہر گیا ہے" "جلنے" "پانی" اب تک ایسا نہیں تھا" وغیرہ

مثال کے طور پر یہ عبارت ملاحظہ ہو۔ "بچپن، جوانی، ادھیڑپن اور بڑھاپا انسانی زندگی کے یہ چار اسٹیج ہیں۔ ان میں آخری اسٹیج بڑا خطرناک بلکہ عبرتناک ہے۔ سبھی ضعیف خطرناک نہیں ہوتے۔ اکثر ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر بے ساختہ ان کی درازی عمر کے لیے دل سے دعا نکل جاتی ہے۔" (مضمون اب تک ایسا نہیں تھا]

تیسری خصوصیت کردار کی "Psychological study" یعنی نفسیاتی مطالعہ ہے معلوم نہیں انہوں نے میری طرح "نفسیات" بہ حیثیت اختیاری یا لازمی مضمون کے پڑھا ہے یا نہیں لیکن ان کے تمام کرداروں میں نفسیاتی مطالعہ نہایت عمیق نظر آتا ہے۔ مثلاً "ہمارے بھی ہیں امتحاں" میں طلباء کی نفسیات" پردیسی ماں" میں ماں کی نفسیات اور "شناس نے کیر دیں ڈاکٹر" میں شناس کی نفسیات وغیرہ۔ نفسیاتی مطالعہ کیلئے یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"ہر طرف سے سوالات کی بوچھار یوں ہوئی ۔ کام والی کی عمر کیا تھی ۔ ؟ صورت شکل کیسی تھی ؟ رنگ کالا تھا یا گورا ؟ شادی شدہ تھی یا کنواری ؟ آپ نے اسے رکھا کیوں تھا ؟ ان سوالات کے جوابات مشکل تھے ۔ شرافت کی مہر کی وجہ سے ہم نے اس طرف دھیان نہیں دیا بعد میں غور کیا تو ماتھا ٹھنکا" (مضمون گویم مشکل)

چوتھی خصوصیت situation مشاہدہ سیچویشن کا تیز اور گہرا مشاہدہ ۔ اس نوع میں بھی ڈاکٹر ضیاء کامیاب ہیں ۔ اس کی مثال مضمون " لاڈ " میں بہت زیادہ نمایاں ہے ۔ جس میں وہ لکھتی ہیں " اگر کنوارا ہے تو ...... ایک مسخوری کے عالم میں نرم ہاتھوں کو اور نرم کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہتا ہے ۔ لیلیٰ مجنوں ۔ ہیر رانجھا ۔ کونسی چوڑیاں چاہئیں ۔ ؟

مصنفہ کی تحریروں کی اہم خصوصیت بے ساختگی ہے ۔ وہ الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر جملے نہیں بناتیں بلکہ جملے ان کے ذہن سے سکوں کی طرح ڈھل کر نکلتے ہیں ۔ لیکن ایک سکہ بھی کھوٹا نہیں ہوتا ایک اور نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی مخالف صنف کو طنز و مزاح کا نشانہ نہیں بناتیں ۔ جیسا کہ بلا لحاظ صنف عام مزاح نگاروں کا شیوہ ہے

ڈاکٹر ضیاء کے تحت الشعور subconcious mind میں طالب علمی کے زمانے ہی سے حس مزاح sense of Humour پرورش پاتی رہی ہے ۔ عمر اور تعلیم کی منزلوں کو طے کرنے کے دوران یہ حس بھی پروان چڑھتی رہی ۔ اور جب انہوں نے کھل کر لکھنا شروع کیا تو ان کے فن میں پختگی آچکی تھی ۔ اب صرف مشق ان کو درجہ کمال تک پہنچا سکتی ہے ۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لکھا کریں " بسیار نویسی " کے الزام کی پرواہ نہ کریں کیونکہ جس تالاب میں زیادہ پانی رہتا ہے وہی کھیتوں کو سیراب کر سکتا ہے ۔

جہاں تک ان کی شخصیت کا تعلق ہے ان کے دیباچہ کا یہ جملہ ..... "جب گھر سے جانا ہو تو سرخ رنگ کی چادر اوڑھے خاموشی سے چلی جاؤں" ان کی مشرقی تہذیب سے وابستگی اور

پاکیزہ خیالات کا آئینہ دار ہے۔ کتاب میں کتابت کی غلطی کو جی ترس گیا۔ البتہ طباعت نے خوش کردیا۔ ملک کی غریبی و خستہ حالی کے پیش نظر (۱۷۶) صفحات کی کتاب کی قیمت صرف بارہ روپے رکھی گئی ہے

برق آشیانوی

ڈاکٹر حبیب ضیاء کا پہلا مضمون جو میں نے زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاس میں سنا تھا وہ تھا "بچہ باہر گیا ہے"۔ ان کے پہلے ہی جملے نے سب کو چونکا دیا اور پھر جہاں جہاں انہوں نے چاہا حاضرین سے قہقہے وصول کئے۔ وہ اپنا مضمون خود ہی سنائیں تو دلنشینی دو دھاری تلوار کی کاٹ بن جاتی ہے۔ لیکن پڑھنے میں بھی ان کے مضامین کا اثر کچھ کم لطف انگیز نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء خالص مزاح کی بھی قائل نہیں ہیں۔ وہ مزاح کی آڑ میں طنز کے نشتر چلاتی ہیں۔ یہ چھوٹے ہتھیار اس چابکدستی سے سماجی ناسوروں اور انسانی کمزوریوں کو نشانہ بناتے ہیں کہ زخم بھی مسکرا اٹھتے ہیں۔

رشید قریشی

ڈاکٹر حبیب ضیاء بظاہر خاموش سی اور غیر ضروری طور پر سنجیدہ نظر آتی ہیں۔ لیکن ان کی کم گوئی اور کم سخنی خیالات کی کم مائیگی نہیں بلکہ بہ نظر احتیاط ہے۔ اور یہ احتیاط ان کے مضامین میں بھی ملتی ہے۔ اس لئے نہ تو ان کے مزاح میں پھلجھڑیوں کی سی کیفیت ہے نہ طنز میں وہ کاٹ کہ آدمی تلملا اٹھے۔ بس ایک تبسم زیر لب، اک ہلکی سی کسک اور یہی اچھے طنز و مزاح کی خصوصیت بھی ہے۔ سلیقہ، اظہار شائستگی اسلوب اور لہجہ کی شگفتگی یہ ہیں

دوسری خصوصیات، ڈاکٹر حبیب ضیاء خوب سے خوب تر کی طرف رواں دواں ہیں۔

پروفیسر بدیع حسینی

ڈاکٹر حبیب ضیاء چور دروازے سے مزاح کے میدان میں آئیں حبیب توفیق کا برقعہ اوڑھے، جیسے انہیں خوف ہو کہ کسی محقق کا مزاح لکھنا اس کے مرتبے کے منافی ہے۔ لیکن جب پردہ ترک کیا اور زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقریب میں برسرعام مضمون پڑھا تو داد و تحسین کی بارش نے ان کے دل سے اس خیال کو دھو دیا اور آج وہ طنز و مزاح کے میدان میں اپنے نام کی طرح مردانہ وار آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ رواں، شستہ، تیکھی زبان، گدگداتے مزاح کے ساتھ طنز کی زیریں لہر، موضوعات میں تنوع، ڈاکٹر حبیب ضیاء کی تحریر کے خاص وصف ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال

اردو ادب میں یوں تو طنز و مزاح کی صنف میں لکھنے والوں میں اضافہ ہوا ہے۔ تاہم اس میں اب بھی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے فطری میلان طبع کے باعث ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اس ذمہ دارانہ اور مشکل صنف ادب کو اپنایا ہے۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء کا طنز و مزاح نہایت لطیف اور سبک ہے۔ جسے پڑھ کر ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم عیاں ہو جاتا ہے۔ اور دل میں کسک انگڑائی لیتی ہے۔ یہی ان کے لہجے کی شگفتگی، اسلوب و اظہار کی شائستگی اور اچھے طنز و مزاح کی دلیل ہے

جاوید عزیز (پاکستان)

حبیب ضیاء نے بھی مزاح نگاری کی طرف توجہ دی ہے۔ دکنی زبان کی قواعد اور مہاراجہ کشن پرشاد حیات اور ادبی کارنامے' جیسی کتابیں بھی انہیں کی ہیں۔ پتہ نہیں یہ احساس کہاں تک درست ہے' لیکن لگتا یہی ہے کہ حبیب ضیاء کا مزاج تحقیق کا زیادہ مزاح کا کم ہے۔ ان کے ہاں طنز و مزاح پر سنجیدگی کی چادر تنی رہتی ہے کہ لطف اندوز ہونا کم ہی ہوتا ہے۔ اور پھر آمد کی کمی۔ آج کے معاشی اور معاشرتی طور پر اوسط طبقے کی زندگی' ان کی کامیابیاں' ان کی محرومیاں اور زندگی گزارنے کے لیے ان کی مساعی وغیرہ' حبیب ضیاء کے موضوعات ہیں۔ ان کی نگاہ تیز ہے جب ان کی قوت احساس میں بھی یہی تیزی اور شدت پیدا ہو گی' تو ان کے مضامین مزہ دیں گے۔ حبیب ضیاء نے طنز کو کام میں لایا ہے اس ضمن میں ان کا دلچسپ مضمون ہے "بچہ باہر گیا ہے" جس میں ان دنوں باہر خصوصاً مشرق وسطیٰ جانے والوں اور یہاں ان کے عزیزوں اور احباب پر اتنے حقیقت پسندانہ طنز ہیں کہ حبیب ضیاء تھوڑی بہت داد وصول کر ہی لیتے ہیں۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

آج کے مادی اور سائنسی دور میں اردو نثر و ادب میں طنز و مزاح کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ عظیم بیگ چغتائی' شوکت تھانوی' پطرس بخاری جیسے ظرافت نگار اب چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی بمشکل نظر آئیں گے اس لئے آپ کی دلچسپ تصنیف "گویم مشکل" بڑی حد تک اس خلاء کو پر کرنے میں معاون ہے۔ امید بندھتی ہے کہ آپ ایسی ہی تخلیقات کے ذریعہ اردو زبان کے ایک اہم لیکن فی الحال تاریک گوشہ کو منور کرتی رہیں گی

مصطفےٰ اشروانی